وہ صورتیں الٰہی

کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

جگن ناتھ آزاد

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں (جے اینڈ کے) انڈیا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

مکتبہ علم و دانش لاہور، پاکستان کی فخریہ پیشکش

آثارِ محروم

("پگڈنڈی" امرتسر کا محروم نمبر)

مرتبہ: امریک آنند

"گزشتہ ربع صدی کے اُردو گو شعراء کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ کسی نے غزل گوئی میں نام آوری حاصل کی ہے تو کسی نے نظم نگاری میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ کسی نے رُباعی کو اپنے خیالات کی جولانگاہ بنایا تو کسی نے مرثیہ اور سلام کو اپنے اظہارِ خیال کے لئے مخصوص کرلیا ہے۔ ایسے بہت کم شعراء ہوں گے جنھوں نے شاعری کی ہر ایک صنف پر طبع آزمائی اور خیال آفرینی کے لافانی نقش ثبت کئے ہوں۔ انہی چند مخصوص شعراء میں حضرت محروم کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ آپ کی وطنی نظمیں ہوں یا غزلیں، رُباعیات ہوں یا سلام، نوحے، بچوں کی نظمیں ہوں یا غیر زبان کا ترجمہ ہوا کلام، ہر ایک صنفِ سخن بلند پایہ ہے....."

نصیر الدین ہاشمی

چوتھا ایڈیشن

قیمت: ۳۰۰ روپے

﴿ ہندوستان میں ملنے کا پتا ﴾

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۳۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کِس دیس بستیاں ہیں

جگن ناتھ آزاد

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں (جے اینڈ کے) انڈیا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ

کتاب کا نام	:	کس دیس بستیاں ہیں
مصنف	:	جگن ناتھ آزاد
سنہ اشاعت	:	۲۰۰۳ء
سرورق	:	شاہد رویش
قیمت	:	۲۰۰/روپے
کمپوزنگ	:	کریسنٹ کمپیوٹرز، جموں-۱۸۰۰۰۱
باہتمام	:	اختر زماں/"سب رنگ" جے اینڈ کے (این جی او)
طباعت	:	ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی
پبلشر	:	کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں

"KIS DES BASTIAN HAIN"
AUTHOR : JAGAN NATH AZAD
2003
PRICE : Rs.200/-
PUBLISHER
CRESCENT HOUSE PUBLICATIONS
267 - JOGI GATE, JAMMU-180001
J&K (INDIA) PH : 0191-2543645.

ملنے کے پتے

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۲۱۳-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷-جوگی گیٹ، جموں-۱۸۰۰۰۱

فرید بک ڈپو تالاب کھٹیکاں، جموں-۱۸۰۰۰۱

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اِنتساب

اپنے مرحوم دوست قتیل شفائی

کے نام

"آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے!"

جگن ناتھ آزاد

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

فہرست

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری	امین بخارا	۹
حکیم صاحب عالم		۳۳
ساحر لدھیانوی		۴۷
حبیب خان کی یاد میں		۶۳
صابر دت		۶۸
یاد یارِ مہرباں		۷۲
کرشن کانت: ایک اُردو دوست		۸۵
سَر شنکر لال		۹۳
علی سردار جعفری (یادوں کے آئینے میں)		۹۷
اوما شنکر جوشی		۱۲۰
چند جُملے (جوش صاحب اور کرشن چندر کے بارے میں		۱۲۸

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ضامن علی خان	۱۳۳
جواہر لعل نہرو	۱۴۳
مولانا وقار انبالوی	۱۷۴
عابد مناوری	۱۸۴
پریم ناتھ در	۱۹۴
شورش کاشمیری	۱۹۷
پطرس بخاری	۲۰۴
کالی داس گپتا رضا	۲۱۵
ڈاکٹر مولانا عبدالحق (جنوبی ہند کے سرسیّد)	۲۱۹
مجروح سُلطان پوری	۲۲۶
سیّد ضمیر جعفری	۲۴۰

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

امین بنجارا

(چیئرمین "سب رنگ" جموں وکشمیر)

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری

وہ صُورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا شمار اُن ادبی شخصیات میں ہوتا ہے جو اپنے تخلیقی عمل کو جس بھی صنف میں آزماتے ہیں اپنی فلسفیانہ بصیرت سے اُس صنف کو معتبر و محترم کر دیتے ہیں۔ جس موضوع کو چُھو لیتے ہیں اپنے احساس و ادراک اور فنی اجتہاد سے اُس موضوع کو جاوداں بنا دیتے ہیں۔ جس پہلو کو اپنی فکری گہرائی کا مرکز بناتے ہیں وہ پہلو ہر سمت سے بجتا، سنورتا اور نکھرتا ہی نہیں چلا جاتا بلکہ بولنے بھی لگتا ہے۔ اِس نوع کی سحر طرازی کے بیسیوں نمونے جگن ناتھ آزاد کے ہاں موجود ہیں۔ ایک عمدہ نمونہ تو اُن کی "اقبالیات" ہے جس کی تفسیر و تفہیم کا اُن کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جس نے اُنھیں بین الاقوامی شہرت سے نوازا ہے۔ دیگر مثالوں میں اُن کی شاعری، نثر نگاری، تحقیق، تنقید اور سفرنامے شامل ہیں۔ اور ——— اُن کی شخصیت نگاری بھی۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

شخصیت نگاری ایسے پیچیدہ اور دُشوار گزار فن میں بھی جگن ناتھ آزاد کا نام ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ بحیثیت شخصیت نگار اُن کی اہمیت کو تب تسلیم کیا گیا جب اُردو زبان وادب سے وابستہ بائیس بلند قد شخصیات کے حالات و واقعات سے مزین اُن کی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" (سنہ اشاعت فروری ۱۹۸۱ء) ہندوستان اور پاکستان دونوں مُلکوں میں منظر عام پر آئی۔ شخصیت نگاری پر مبنی اُن کی دُوسری کتاب "اپنی محفل اپنے دوست" ہے جس میں اُن کے اُنیس احباب کے قلمی مُرقعے جلوہ افروز ہیں اور "کس دیس بستیاں ہیں" اسی موضوع پر لکھی ہوئی اُن کی تیسری کتاب ہے جس میں اُنھوں نے بیس ممتاز شخصیات کی خاکہ کشی بڑی مہارت سے کی ہے۔ ان تینوں کتابوں کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں بھی اُن کی شخصیت نگاری پڑھنے کو ملتی رہتی ہے۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں" میں آزاد نے علامہ تاجور نجیب آبادی، مولانا صلاح الدین، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولوی عبدالحق، شیخ (سر) عبدالقادر، بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو، مہندر ناتھ، سلیمان اریب، عرش ملسیانی، محمد دین تاثیر، دُرگا پرشاد دھر، کرشن چندر، رشید احمد صدیقی، سیّد سجاد ظہیر المعروف بنّے بھائی، جاں نثار اختر، نریش کمار شاد، حسرت موہانی، پریم ناتھ دَر اور اپنے والدِ محترم ملوک چند محروم کے بارے میں اپنے تاثرات بلا مبالغہ اور معروضی انداز میں بیان کئے ہیں۔ "اپنی محفل اپنے دوست" میں جوش ملیح آبادی، مالک رام، ڈاکٹر خلیق انجم، سیّد حامد، علی سردار جعفری، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر قمر رئیس، سلیم جعفری، آپا حمیدہ سلطان احمد، مظفر حسین برنی، گوپال متل، حکیم عبدالحمید، عاشور کاظمی، رفعت سروش، جمنا داس اختر، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، دینا ناتھ مست، کے ایل نارنگ ساقی اور اُردو کے ایک طالب علم شاہ نواز کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کو صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے۔

"کس دیس بستیاں ہیں" میں اُنھوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو، پطرس بخاری، شورش کاشمیری، محمد حبیب خان، ضامن علی خان، ضمیر جعفری، کالی داس گپتا رضا، افضل العلماء

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ڈاکٹر عبدالحق (جنوبی ہند کے سر سیّد)، مجروح سلطان پوری، پریم ناتھ در، مولانا وقار انبالوی، عابد مناوری، اوما شنکر جوشی (گجراتی زبان کے نامور شاعر و ادیب)، علی سردار جعفری، سَر شنکر لال، کرشن کانت (نائب صدر جمہوریہ ہند)، عاشق اقبال ممنون حسن خان، صابر دت، حکیم صاحب عالم، کرشن چندر، جوش ملیح آبادی اور ساحر لدھیانوی کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری کا جائزہ لینے سے قبل یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ آزاد صاحب نے جن حضرات پر قلم اُٹھایا ہے یا جنھیں اپنی "داستانِ حیات کا ایک ورق"[1] قرار دیا ہے اُن کے ساتھ آزاد کا' یا آزاد کے ساتھ اُن حضرات کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رہا ہے اور دونوں صورتوں میں آزاد اپنے ان بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں سے کہیں نہ کہیں متاثر ہوئے ہیں۔ بقول آزاد "ان سب نے میری زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور کیا ہے"[2] اور ممدوحین کے اُنھی پہلوؤں پر آزاد نے روشنی ڈالی ہے جن پہلوؤں سے وہ متاثر ہوئے۔ آداب و اخلاص، اتحاد و اتفاق، انسان دوستی، محبت و اخوت، مذہبی رواداری، بے تعصبی، عقیدت و احترام اور دردمندی سے لبریز ان نجی داستانوں کو آزاد نے یوں تخلیق کیا ہے کہ نہ صرف انسانیت کی اعلیٰ اخلاقی قدریں کھل کر سانس لیتی نظر آتی ہیں بلکہ آزاد کے دل کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دیتی ہیں۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں" اور "کس دیس بستیاں ہیں" میں شامل ایک آدھ مضمون کو چھوڑ کے تمام مضامین آزاد نے اپنے احباب کے اس جہانِ فانی سے اُٹھ جانے کے بعد لکھے ہیں۔ ان مضامین کے لکھنے کا مقصد جہاں اپنے دوستوں اور بزرگوں کے اوصاف بیان کر کے اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کرنا نظر آتا ہے وہاں یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ آزاد مرحومین کا ذکرِ خیر کر کے زندگی کرنے کے وسائل بھی تلاش کر رہے ہیں۔ اپنی ذات کو جدائی کے صدمات سے نجات دلانے کے لئے اور مفارقت کے اثرات کو کم کرنے کے لئے آزاد کو بہتر راہ یہی نظر آئی کہ یادوں

---

1. جگن ناتھ آزاد: (حرفِ اول) "آنکھیں ترستیاں ہیں" صفحہ ۵
2. جگن ناتھ آزاد: (حرفِ اول) "آنکھیں ترستیاں ہیں" صفحہ ۵

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کی برات سجائی جائے، بیتے لمحوں کو یاد کیا جائے اور ممدوحین سے اپنے خوشگوار تعلقات کو جگنوؤں کا رنگ روپ دے کر رہبری کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' کے حرفِ اوّل میں آزاد اسی کیفیت سے دوچار نظر آتے ہیں:

> ''یہ مقالات (دو ایک کو چھوڑ کر) جو ان تمام حضرات کی موت کے بعد میں نے لکھے ایک طرح سے اپنی زندگی کے اُس خلا کو پُر کرنے کی کوشش ہے جو بھری بزم سے ان عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کے یکے بعد دیگرے اُٹھ جانے سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔''[1]

''اپنی محفل اپنے دوست'' میں، جیسا کہ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے، جگن ناتھ آزاد نے اپنے اُن دوستوں اور رفیقوں کا ذکر کیا ہے جو مضامین لکھتے وقت بفضلِ الٰہی حیات تھے لیکن اس کتاب کی ترتیب و طباعت کے دوران ہی میں ان میں سے بعض حضرات انھیں داغِ مفارقت دے کر چلے گئے۔ البتہ اس ''محفل'' میں شامل اُن کے کئی احباب آج بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے اپنے معمولات میں مصروف ہیں۔[2] اس کتاب کے ''حرفِ اوّل'' میں آزاد لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک خاکہ نگاری یا میری یادداشتوں کے اوراق کا تعلق ہے، زیرِ نظر کتاب ''اپنی محفل اپنے دوست'' میرا دوسرا مجموعۂ مقالات ہے۔ پہلا مجموعہ ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' کے نام سے ہندوستان میں دو بار اور پاکستان میں تین بار شائع ہو چکا ہے۔ دونوں مجموعوں میں فرق یہ ہے کہ ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' اُن مقالات پر مشتمل ہے جو راقم التحریر نے اپنے دوستوں اور بزرگوں کے انتقال کے بعد اُن کی یاد میں لکھے۔ (ہاں اُس

---

1. جگن ناتھ آزاد (حرفِ اوّل) ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' صفحہ: ۷
2. میں دعا گو ہوں کہ خداوند کریم انھیں صحت، خوشحالی اور عمرِ خضر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین [illegible]

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کتاب کا ایک مضمون "کرشن چندر" کرشن چندر کی زندگی ہی میں
لکھا گیا تھا۔ اب یاد نہیں آ رہا ہے کہ اُس مضمون کو یادِ رفتگاں میں
شامل کرنے کا سبب کیا تھا)

زیرِ نظر کتاب "اپنی محفل اپنے دوست" میں
جس قدر مقالات شامل ہیں وہ اپنے دوستوں کی زندگی ہی میں
لکھے گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت جب اس کتاب کا
مسودہ طباعت کے لئے مطبع کو بھیجا جا رہا ہے ان میں سے بعض
اصحاب ہمیں داغِ فُرقت دے چکے ہیں مثلاً جوش ملیح آبادی،
مالک رام، سردار جعفری، سلیم جعفری، آپا حمیدہ سلطان، گوپال متل،
حکیم عبدالحمید، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور دینا ناتھ مست۔ لیکن
حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے ان دوستوں کو جو ہم سے جُدا ہو گئے
ہیں فراموش نہیں کر سکتا....."[1]

جگن ناتھ آزاد ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اور اس کا اندازہ ادب کی مختلف اصناف میں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اُنھوں نے غزل، مرثیہ، مثنوی، رُباعی، قطعہ اور نظم میں اپنی انفرادیت کو بحال رکھا ہے اور ہر صنف کو یوں نبھایا ہے جیسے وہ اُسی صنف کے اُستاد ہوں۔ یہی کیفیت اُن کی نثر نگاری میں بھی پائی جاتی ہے۔ اقبال اُن کا پہلا عشق ہے اور آخری بھی اس لئے اُن کی نثر میں اقبال کا ظاہر ہونا قدرتی امر ہے اور "اقبالیات" کے حوالے سے اُن کے کام کو استناد کا درجہ حاصل ہو چکا ہے لیکن نثر کے دُوسرے شعبہ ہائے جات مثلاً تنقید، تحقیق، انشا پردازی، سفرنامے اور سوانح نگاری یا خاکہ نگاری میں بھی اُن کی

---

[1] جگن ناتھ آزاد، (حرفِ اوّل) "اپنی محفل اپنے دوست" سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء، ناشر: کریسنٹ بکس پبلی کیشنز جموں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بصیرت و بصارت قاری کے لئے غور و فکر کے نئے نئے راستے ہموار کرتی چلی جاتی ہے۔

شخصیت نگاری میں جگن ناتھ آزاد کی انفرادیت اُن کے اندازِ بیاں میں پنہاں ہے۔ ہمارے ہاں شخصیت نگاری کا format کچھ یوں ہے کہ شخصیت نگار ممدوح کے خدوخال کا سہارا لے کر یا آنکھ ناک مُنھ کی لمبائی چوڑائی بیان کر کے اپنی بات کو آگے بڑھائے اور اکثر ایسا ہی ہے۔ حالانکہ بعض اچھے خاکہ نگاروں یا شخصیت نگاروں نے اس طریقہ کار سے گریز کیا ہے لیکن کہیں نہ کہیں وہ بھی ہاتھ میں پیمائش کا آلہ تھامے ممدوح کے اردگرد چکر کاٹتے نظر آتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ نہ تو ممدوح کے رنگ کا سہارا لیتے ہیں نہ اُن کے خدوخال کی لمبائی چوڑائی کو اپنے مضمون کی تمہید بناتے ہیں۔ بلکہ وہ ڈائریکٹ ہی ممدوح کی سیرت کا تذکرہ چھیڑتے ہیں، اُس کی رُوح کی بات کرتے ہیں، اُس کے اعمال، افعال، کردار، ماحول، کیفیت اور اپنے تاثرات اور ردِ عمل کی بات کرتے ہیں۔ وہ بھی اس انداز سے کہ پڑھنے والا اُس قلمی مرقعے کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور جب تک مضمون ختم نہیں ہوتا قاری خود کو اس کا ایک جزو محسوس کرتا رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات دیکھئے کہ آزاد کس طرح ممدوحین کی سیرت، شخصیت، رُوح اور ردِ عمل کا ذکر چھیڑتے ہیں:

> ''مولانا صلاح الدین احمد کی موت ایک فرد کی موت نہیں ایک ادارے کی موت ہے۔ ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ مولانا کی ذات روشنی کا ایک مینار تھی جس نے کتنے ہی نئے اذہان کو منور کیا۔ کتنے ہی نا آزمودہ کار مسافروں کی منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کی اور کتنے ہی ذرّوں کو چمکا کر انھیں آفتاب و ماہتاب کی تجلی عطا کی۔''
>
> (صلاح الدین احمد مشمولہ ''آنکھیں بولتی ہیں'')

''کیا ہنس مکھ چہرہ تھا!

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اُس ہنس مکھ چہرے سے میری پہلی مُلاقات آج سے بارہ برس قبل ہوئی ۔ جب میں ایم ۔اے میں داخل ہونے کے لئے راولپنڈی سے لاہور آیا۔ گورنمنٹ کالج میں ایک مشاعرہ تھا۔ پروفیسر بشیر احمد ہاشمی کی زیرِ صدارت ۔اُس میں ڈاکٹر تاثیر نے اپنی مشہور نظم "رس بھرے ہونٹ" پڑھی تھی۔ مشاعرے کے بعد وقار انبالوی کے ذریعے اُن سے تعارف ہوا۔ دو چار منٹ تک باتیں ہوئیں اور میں نے محسوس کیا کہ اگر اس عالم فن کار سے میری مُلاقات ہوتی رہی تو مجھے بہت کچھ حاصل ہوتا رہے گا۔"

(محمد دین تاثیر "مضمون" آنکھیں ترستیاں ہیں")

"کالی داس گپتا رضا کا انتقال پُر ملال صرف اُردو دُنیا ہی کے لئے ایک حادثہ عظیم نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ساری ادبی دُنیا کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ کالی داس گپتا ایک باکمال شاعر، مستند نقاد اور معتبر محقق تھے۔ غالب اُن کا خاص موضوع تھا۔"

(کالی داس گپتا رضا کی یاد میں "مضمون" کس وس بقیاں ہیں")

"ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک مضمون میں اپنے متعلق کچھ اس طرح کی بات لکھی ہے کہ میں سڑک کا آدمی ہوں.....
جامع مسجد کی سیڑھیوں کے قریب ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھا کرتا تھا.....۱۹۴۷ء میں بارہ برس کی عمر میں والد کا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

انتقال ہوگیا..........

کسرِ نفسی یقیناً ایک خوبی ہے لیکن ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط
لکھنے سے کوئی شخص سڑک کا آدمی نہیں بن جاتا۔"

(ڈاکٹر خلیق انجم مشمولہ "اپنی محفل اپنے دوست")

ایک کامیاب شخصیت نگار کی حیثیت سے جگن ناتھ آزاد نے اپنے موضوعات کو پیش کرتے وقت جذبات پر قابو رکھنے کی سعی کی ہے اور اپنے اساتذہ، بزرگوں اور دوستوں کے تئیں اپنے خلوص اور واجبات کا اظہار کرتے ہوئے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ وہ ان شخصیات سے متاثر ضرور ہوئے ہیں لیکن جذبات کی رو میں بہہ کر ذرّے کو آفتاب نہیں کہا۔ انھوں نے حقِ دوستی ادا کرتے وقت خود کو سنبھالے رکھا ہے۔ اپنے ممدوحین کے تئیں اپنی محبت کا اظہار آزاد نے محبت کے دائرے ہی میں رہ کر کیا ہے اور جس شخصیت سے جس قدر متاثر ہوئے اُسی قدر ہی اُس کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ مرحومین کو یاد کرتے وقت بھلے ہی آزاد کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ریلے اُمڈ آتے ہیں، دوستوں کا ذکر کرتے وقت اُنس کے شگوفے بھی کھل اُٹھتے ہیں لیکن کسی بھی صورت میں وہ اپنی تحریر کو عدم توازن کا شکار نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی تحدید یا تخصیص کی بنا پر پاسداری کے پیشِ نظر الزامات اپنے اُوپر عائد ہونے دیتے ہیں۔ مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا صلاح الدین احمد اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اُن کے استاد تھے، تلوک چند محروم صاحب اُن کے والدِ محترم تو تھے ہی ساتھ ہی اُستاد بھی تھے اور اُنھی کی شخصیت کا سب سے زیادہ اثر آزاد نے قبول کیا۔ لیکن اپنے والد اور اساتذہ پر مضامین قلم بند کرتے وقت بھی آزاد نے اپنی اعتدال پسندی کا مظاہرہ کیا اور شخصیت نگاری کی صحت مند روایات میں کئی نئے ابواب کا اضافہ کیا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی ادبیات میں آزاد کے اُستاد تھے۔ اس کثیر الصفات ہستی کو یاد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اس وقت جب میں اُن کے بارے میں بات چیت کر رہا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہوں اُن کی زندگی کے مختلف گوشے ایک فلم کی طرح میری نظر کے سامنے رواں دواں ہیں اور میں حیران ہوں کہ اُن کی بھرپور شخصیت کے کس کس پہلو کا ذکر کروں۔ اُن کی علمیت' اُن کی زبان دانی، اُن کی اصلاحِ سخن، اصلاحِ نثر، اُن کا طنز و مزاح، اُن کی کردار نگاری، شاعری، بدیہہ گوئی، نثر نگاری، مکاتیب' ان تمام باتوں کے مختصر ذکر کے لئے بھی دفتر درکار ہیں۔ یہ وہ کہانی نہیں کہ باتوں باتوں میں سُنا دی جائے۔"

(تاجور نجیب آبادی مشمولہ "آنکھیں ترستیاں ہیں")

چند شخصیات کے بارے میں آزاد یوں گویا ہوتے ہیں:

"اوما شنکر جوشی کی شاعری ایک مفکر شاعر کی شاعری تھی، ایک ایسے مفکر شاعر کی شاعری جو سر سے پاؤں تک ہندوستان کی صالح روایات میں ڈوبا ہوا تھا اور جس نے ان روایات کی تفسیر و تعبیر میں اپنی تخلیقی اور فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان کی تشکیل نو ہی نہیں کی بلکہ اُنھیں ادب العالیہ کا پیکر بھی عطا کیا اور ادب العالیہ کی رُوح بھی۔ اِس اعتبار سے جب ہم اُن کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اُنھیں بھی وہی اندازِ فکر ودیعت ہوا تھا جو قسّامِ ازل کی طرف سے اقبال کے حصّے میں آیا تھا۔"

(اوما شنکر جوشی مشمولہ "کس دیس بستیاں ہیں")

"اِس ضمن میں جو بات مُجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورۂ فاتحہ شروع کرانے سے قبل ہی مُجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اُٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا۔ کلامِ پاک کا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

احترام تو مجھے ابتداء ہی سے گھر میں سکھایا گیا تھا لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیمِ قرآن کی ابتداء اس احترام سے کی اور سورۂ فاتحہ پڑھانے سے قبل ہی مجھے رُوحِ مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔"

(مالک رام مشمولہ "اپنی محفل اپنے دوست")

"والد اُستادی شاگردی کے سلسلے سے بالکل بے نیاز رہے۔ شعر میں اُن کا کوئی اُستاد ہے نہ اُنھوں نے کسی کو اپنا شاگرد بنایا ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک استثناء موجود ہے اور وہ استثناء ہے خوش فکر شاعر بے مثل سرشار کی۔ ان کے علاوہ کسی نے مشورہ مانگا تو جواب دے دیا۔ اُنھیں ہندو پاکستان کے گوشے گوشے سے اس مضمون کے خطوط اکثر آتے رہتے تھے کہ میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ آپ جواب میں یہی لکھتے تھے کہ مطالعہ اور مشق جاری رکھئے۔ جوہر ہوگا تو چمک اُٹھے گا۔ اصلاح لینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

(محترم میرے والد مشمولہ "آنکھیں ترستیاں ہیں")

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری کی وساطت سے جہاں اُردو اور معاشرے کی قد آور شخصیات کے ساتھ اُن کے روابط کی نوعیت کا علم ہمیں ہوتا ہے وہیں اُن شخصیات کے علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی نظریات سے بھی آگہی ہوتی ہے۔ آزاد نے ممدوحین کے باطنی خدوخال ہی بیان نہیں کئے ہیں اپنے اور ممدوحین کے مابین تعلقات پر صرف اپنے تاثرات ہی پیش نہیں کئے ہیں بلکہ ممدوحین کے افکارِ عالیہ اور اُن کے مخصوص نقطۂ نظر کو بھی زیرِ بحث لانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ممدوحین کے دل و ذہن میں اُٹھنے والی مخصوص سوچوں کی لہروں میں قاری کو

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بہالے جانے کا کمال آزاد کو کس حد تک حاصل ہے اس کا ثبوت مندرجہ ذیل اقتباسات ہیں:

''اس وقت مولانا کے شاگردوں کی فہرست گنوانا میرا مقصد بھی نہیں اور تمام نام مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں ایک بات کی طرف ضرور اشارہ کرنا چاہوں گا اور وہ یہ کہ مولانا کے ہندو شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پنجاب میں بلکہ سارے ہندوستان میں اُردو کی ترویج واشاعت کے بارے میں مولانا مرحوم کا ایک خاص نظریہ تھا۔ اور وہ یہ کہ جب تک اُردو ہندوؤں میں مقبول نہیں ہوگی اس کا کوئی مستقبل نہیں اور ہندوؤں میں اُردو کو مقبول بنانے کے لئے مولانا نے سردھڑ کی بازی لگادی۔''

(تاجور نجیب آبادی، مشمولہ ''آنکھیں ترستیاں ہیں'')

''نہ جانے جوش کو کیا سوجھی کہ عقل کے سامنے اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کی تبلیغ شروع کردی۔ اس معاملے میں عقل علم کا سمندر ہے۔ جوش کا لگاؤ سیاست کے ساتھ محض ایک جذباتی قسم کا تھا اور جوش ہزار منطق منطق کرتے رہیں عقل ایسے جغادری کے سامنے کہاں ٹھہر سکتے تھے۔ آخر اس بات چیت اور مباحثے کی تان یہاں آکر ٹوٹی ——— عقل صاحب نے سوشلزم کی ماہیت بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ جوش صاحب! سوشلزم کی جو تعریف آپ نے کی ہے اور جو خوبیاں آپ نے بیان کی ہیں، اُن کے پیشِ نظر سوشلزم رُوس میں نہیں بلکہ برطانیہ میں ہے۔ جوش اس وقت بحث ہار چکے تھے۔ کہنے لگے ''ہاں تو ٹھیک ہے۔ سوشلزم اپنی صحیح صورت میں برطانیہ ہی میں ملتا ہے۔''

(کرپال عقل، مشمولہ ''اپنی محفل اپنے دوست'')

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

''والدِ محترم اور میں، ہم دونوں وقتِ ملاقات پر پہنچے۔ ذرا سی بات چیت کے بعد والدِ محترم نے کتابیں پیش کیں۔ پنڈت جی بلا مبالغہ کوئی دس منٹ تک دونوں کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔ متن کے بعد دیباچوں کے صفحات پر نظر ڈالی اور کہنے لگے۔ ''محروم صاحب' کتابیں بچوں کے لئے ہیں لیکن شروع کے صفحات کی کتابت بہت باریک قلم سے کی گئی ہے۔''

(جواہر لعل نہرو کی یاد میں مطبوعہ ''کس دیس بستیاں ہیں'')

کسی شخصیت کا زندہ جاوید خاکہ کھینچنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شخصیت نگار اپنے موضوع کے حوالے سے جملہ صداقتوں کا سہارا لے اور کہیں بھی، کسی بھی مقام پر مبالغہ آرائی سے کام نہ لے۔ جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری میں یہ وصف پوری طرح موجود ہے۔ اُنھوں نے جن شخصیات پر قلم اُٹھایا ہے اُن کے تئیں عقیدت و احترام کا بے پناہ جذبہ رکھنے کے باوجود جانبداری سے کام نہیں لیا ہے اور بڑی صدق دلی اور بے باکی سے واقعات بیان کئے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے ساتھ گزارے ہُوئے لمحات کو آزاد اپنا گراں بہا اثاثہ قرار دیتے ہیں لیکن اس بات کو نہیں چھپاتے کہ جوش اپنے آپ کو اقبال سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں آزاد لکھتے ہیں:

''اقبال کا تعریفی انداز میں ذکر جوش صاحب کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خدا جانے اقبال کے تعلق سے کون سا احساسِ کمتری اُن کے اندر کام کر رہا تھا کہ اقبال کی بات ہوتی تھی تو اُن کی کیفیتِ انقباض اُن کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اقبال کے بعد اہلِ ملک نے عزت و احترام کے خزانے انھی (جوش صاحب ہی) پر نچھاور کر دئے تھے لیکن وہ غالباً اس قدر دانی سے مطمئن نہیں تھے۔ اُن کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ وہ اقبال سے زیادہ بڑے شاعر ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اقبال کو بڑا شاعر

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔"

(جوش ملیح آبادی: ابتدائی خاکہ نگاری "شعلہ" اپنی محفل اپنے دوست")

آزاد کی شخصیت نگاری میں، جیسا کہ اُوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے، سچائی پہلا عنصر ہے۔ وہ بڑی سادہ دلی سے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو کسی دُوسرے کو کہنا ہو تو وہ شائد صاف لفظوں میں نہ کہہ سکے۔ اپنی ذات کو خداداد صلاحیتوں کا مجسمہ قرار دینے والوں اور خود کو ادب کے قطب مینار سمجھنے والوں کو اگر کچھ کہنا بھی پڑے تو اُن کا لب ولہجہ مُبہم سا ہوتا ہے۔ لیکن آزاد کی صاف گوئی دیکھئے کہ اپنی ذات کی بھی پرواہ نہیں کرتے:

"مولانا نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے میرے سارے کردار کا جائزہ لے رہے ہوں اور مجھے ایسا گمان ہوا کہ میری غزل یا مقالے کے بارے میں اُنھیں بیدارؔ (کرپال سنگھ بیدارؔ) کی بات کا یقین نہیں آرہا ہے۔ اُنھوں نے جواب میں کچھ کہا بھی جو میں اُس وقت نہیں سمجھا۔ دو ایک روز بعد گوپال متل نے مجھ سے پوچھا ——— "تم نے سُنا تھا مولانا نے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا "سُنا تو تھا لیکن سمجھا نہیں۔" گوپال متل نے کہا "اس فقرے کے معنی یہ تھے کہ تم خود کیا شعر کہتے ہو گے اپنے والد کا کلام اپنے نام سے چھپواتے ہو گے۔" اور مولانا کا فقرہ یہ تھا ——— "اب مخروم صاحب کو شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے؟"

(تاجور نجیب آبادی "شعلہ" آنکھیں نہ ستیاں ہیں")

"ایک دن کی بات ہے میں گھر سے مکتبہ اُردو کو جا رہا تھا۔ کرشن شائد اپنے دفتر سے آرہے تھے یا مکتبہ اُردو سے۔ سرکلر روڈ پر دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کی بات چیت شروع

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہوئی۔ اچانک اُنھیں کچھ یاد آ گیا۔ بولے سُنا ہے کل تُم "ادبی دُنیا" کے دفتر میں یوسف ظفر کے ساتھ اُلجھ گئے اور اِس بات پر مُصر رہے کہ کرشن چندر، پریم چند کے قد و قامت کا نثر نگار ہے۔ میں نے کہا کہ الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن ہاں' کچھ ایسی ہی بات میں نے کہی تھی۔ مُجھ سے نصیحت کے انداز میں کہنے لگے کہ ادبی بحث میں کسی کے ساتھ اُلجھنا نہیں چاہئے۔ تنقیدی مقالے لکھنا شروع کرو تو یہ اُلجھنے کی عادت ختم ہو جائے گی......"

(چند جملے: جوش صاحب اور کرشن چندر کے بارے میں "مشمولہ" کس ورلیں بستیاں ہیں")

اب اِن اقتباسات کے بعد آزاد کی صاف گوئی اور کرشن چندر کی بلند قامتی کے لئے کسی طرح کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

کسی شخصیت کے کردار کی ہو بہو تصویر پیش کرنا خاصا مُشکل کام ہے اور وہ بھی خاکہ نگاری ایسے مختصر حدود رکھنے والے فن میں۔ سوانح نگاری میں طوالت کی وجہ سے اِس امر کی گنجائش موجود رہتی ہے اور" کچھ یہاں کچھ وہاں" کر کے شخصیت نگار ممدوح کے قریب قریب سارے اوصاف بیان کر لیتا ہے۔ لیکن چند صفحات پر مشتمل ایک مضمون میں ممدوح کے سارے اوصاف بیان کرنے اور اُس کی شخصیت کے ہر ایک پہلو کو گرفت میں لانے کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزاد صاحب شخصیت نگاری میں اِس مہارت کا بھر پور مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اختصار سے کام لیتے ہوئے نپے تُلے الفاظ میں شخصیت کو یوں نمایاں کرتے ہیں کہ ممدوح واضح طور پر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ مثلاً مجروح سُلطان پوری کا خاکہ لکھتے وقت مجروح کی عالمانہ حیثیت اِن دو جملوں میں بیان کرتے ہیں"......میں نے دیکھا کہ مجروح کو فارسی اور عربی پر عبور ہے......عمدہ شاعری کے ساتھ ہی ساتھ علم کا خزانہ بھی مجروح کے پاس ہے۔"[1] جب عبدالمجید

---

[1] جگن ناتھ آزاد (مجروح کی یاد میں) مشمولہ" کس ورلیں بستیاں ہیں" ناشر" گریسنٹ ہاؤس دہلی کشمیر جموں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سالک کی شخصیت پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں تو ایک آدھ سطر ہی میں اُن کی پوری ہستی کو سمو لیتے ہیں" ...وہ فکرِ معانی کے،علم و ادب کے،فنِ گفتگو کے ایک بحرِ بے کنار تھے۔"[1] سیّد حامد کا خاکہ کھینچتے ہیں تو اُن کی شاعرانہ خوبیوں کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں" سیّد حامد کے یہاں آکر عشقیہ شاعری نے پاکیزگی اور شائستگی کا ماحول پیدا کیا۔"[2] اسی طرح سیّد ضمیر جعفری والے مضمون کا یہ ایک جملہ کہ" یہ محبت بھری تحریر میرے لئے کسی اچھے قومی یا بین الاقوامی اعزاز سے کم نہیں ہے"[3] ضمیر جعفری کے پورے علمی و ادبی قد کو نمایاں کر دیتا ہے۔ڈاکٹر عبدالحق کے خاکے میں آزاد لکھتے ہیں کہ" وہ علم و فضل کا ایک سمندر تھے۔"[4] اس ایک جملے کو پڑھنے کے ساتھ ہی عبدالحق کی ساری شخصیت آنکھوں میں اُتر آتی ہے۔اختصار اور اجمال کی ایسی ہی مثالوں سے آزاد کی شخصیت نگاری پوری طرح مملو ہے۔

آزاد کی شخصیت نگاری محبتوں کا والہانہ اظہار تو ہے ہی ساتھ ہی اُن کے حافظے کا کمال بھی ہے۔ظاہر ہے کسی کی سیرت کشی کے لئے اُن تمام لمحات اور اوقات کو کھنگالنا ضروری ہے جو لمحات یا اوقات اُس شخصیت کے ساتھ گزرے ہوں۔اکثر لوگوں کو کل کی بات یاد نہیں رہتی اور اِدھر ساٹھ ستر برس کو محیط عرصے کی یادوں کو سمیٹنا اور قاعدے کے ساتھ بیان کرنا' یہ آزاد ہی کا خاصہ ہے۔اگر آزاد کے پاس ایک بھرپور زندگی کی یادوں کی دولت کا انبار،واقعات میں ربط اور کمال کا حافظہ نہ ہوتا تو وہ کبھی قلم برداشتہ یہ نہ لکھ پاتے کہ:

> "مولانا کو سب سے پہلے میں نے راولپنڈی میں دیکھا۔ایک مشاعرے میں،یہ غالباً ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔مجھے اتنا یاد ہے کہ اُس مشاعرے کا انتظام عبدالعزیز فطرت مرحوم نے کیا تھا۔"

۱۔ جگن ناتھ آزاد (عبدالمجید سالک)مشمولہ" آنکھیں ترستیاں ہیں" صفحہ ۸۷

۲۔ جگن ناتھ آزاد (مجموعہ کلام: سیّد حامد)مشمولہ" اپنی محفل اپنے دوست"

۳۔ جگن ناتھ آزاد(ضمیر جعفری کے بارے میں)مشمولہ" کس دیس بستیاں ہیں"

۴۔ جگن ناتھ آزاد(بابائے اردو کے مرتبہ: ڈاکٹر مولوی عبدالحق)مشمولہ" کس دیس بستیاں ہیں"

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

(حضرت موہانی "مشمولہ" آنکھیں ترستیاں ہیں")

"میں نے ۱۹۳۳ء میں بریڈ لا ہال ہاؤس لاہور کے مشاعرے
میں جو رابندر ناتھ ٹیگور کے اعزاز میں مسز نائیڈو کی زیرِ صدارت
منعقد ہوا تھا۔ اُن کا کلام اُن کی زبان سے سُنا تھا....."

(سروجنی نائیڈو "مشمولہ" آنکھیں ترستیاں ہیں")

"تین چار برس کی عمر سے بعد کے واقعات میری یادوں کے
دُھندلکے میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ گویا آئندہ سطور صرف شنیدہ
ہی کی نہیں بلکہ شنیدہ اور دیدہ دونوں پہلوؤں کی حامل ہوں گی۔"

(محروم میرے والد "مشمولہ" آنکھیں ترستیاں ہیں")

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری کا ایک نمایاں وصف اُن کی سادہ، شگفتہ اور رواں دواں نثر ہے۔ اُن کی نثر کی سادگی اور روانی اور اُن کے منجھے ہوئے اُسلوب نے ممدوحین کی تصویروں کو رنگین بھی بنایا ہے اور ہر ایک پہلو سے انھیں تاثیر بھی عطا کی ہے۔ آزاد کی شخصیت نگاری کے چمن ہائے رنگا رنگ میں آزاد خود بھی کسی گلِ نو بہار کی طرح ہر ایک شاخ پر مہکتے نظر آتے ہیں لیکن مہکنے کا انداز ایسا کہ ہر جگہ رنگوں اور خوشبوؤں کے بوجھ سے جُھکے جُھکے۔ بات والد کی ہو تو فرمانبردار، ذکر اساتذہ کا ہو تو نیاز مند، رُوداد دوستوں کی ہو تو عاجز اور عزیزوں کا ذکر ہو تو بھی منکسر۔ خودنوشت اور شخصیت نگاری میں ایسا ہوتا ہی ہے کہ لکھنے والا ہر جگہ موجود رہتا ہے کیونکہ اُسے تمام تر واقعات اپنے حوالے سے بیان کرنا ہوتے ہیں تاہم اُس کا بڑپن یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ ہوتے ہوئے بھی دُوسروں ہی کی موجودگی کا احساس دلائے نہ کہ اپنی موجودگی کا۔ آزاد کے ہاں سارا فوکس دُوسروں ہی پر ہے۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں"، "کس دیس بستیاں ہیں" اور "اپنی محفل اپنے دوست"، ان تینوں کتابوں میں شامل ممتاز شخصیات کے سوانحی خاکے جہاں اُن شخصیات کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ کرتے ہیں وہاں جگن ناتھ آزاد کی انسان دوستی، مذہبی رواداری، اقبال

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

شناسی، تحقیق اور تنقید نگاری سے بھی ہم متعارف ہوتے ہیں۔ مذہبی رواداری اور اتحاد و اتفاق کا پہلا درس تو آزاد نے اپنے والدِ محترم ہی سے حاصل کیا تھا لیکن اُن کے رُفقاء اور اپنے اساتذہ کی انسان دوستی سے بھی آزاد اس قدر متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے اس خصوصیت کو اپنا شعار بنا لیا اور اُن کے مرتب کیے ہوئے شخصی خاکے اس کا بین ثبوت ہیں۔ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے کربناک واقعات کا ذکر کرتے ہوئے، اپنے وطن سے جدائی کی درد بھری کہانی سُناتے ہوئے آزاد کا لہجہ رُوہانسا ضرور ہو جاتا ہے لیکن کہیں بھی کسی کے لئے اُن کے دل میں کوئی کینہ، کوئی گلہ شکوہ نظر نہیں آتا۔ اپنے مُسلمان اساتذہ، بزرگوں اور دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے یا اسلام، قرآن پاک، حضورؐ اور احادیث کے حوالے دیتے ہوئے وہ ادب و احترام اور واجبات کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پاکستان کے پہلے قومی ترانے کے خالق آزاد آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کے خواہاں ہیں اور اس کے واضح اشارے اُن کی شخصیت نگاری میں موجود ہیں۔

تحقیق و تنقید کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں "نشانِ منزل" اور "تعمیرِ فکر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "اقبال اور مغربی مفکرین"، "اقبال اور کشمیر"، "ہندوستان میں اقبالیات" اور "اقبال اور اُس کا عہد" بھی بنیادی طور پر تحقیق اور تنقید پر مبنی ہیں لیکن اب ان کتابوں کو آزاد کی "اقبالیات" میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ان تمام کتابوں کے مطالعے کے دوران میں آزاد ایک بلند پایہ مُحقق و ناقد اور ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور اُن کی ان سبھی حیثیتوں کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اب اس طرح کا جامع الصفات ادیب اور شاعر، محقق و ناقد اگر شخصیت نگاری کے شعبے میں تین تین کتابوں کا اضافہ کرتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کتابوں میں تحقیق اور تنقید نہ ہو۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں" کے خاکے آزاد کی تحقیق سے تو مملو ہیں ہی اُن میں اعلیٰ درجے کی تنقید بھی موجود ہے۔ کسی کا سیرت نامہ تخلیق کرتے ہوئے اُس کے فکر و فن پر ناقدانہ آراء کا اظہار کرنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ اکثر خاکوں میں خوبیوں ہی کا بیان کیا جاتا ہے اور شخصیت اور فن

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کے معائب بیان کرنے یا موضوع سے ہٹ کر کوئی بات کہنے سے اجتناب برتا جاتا ہے لیکن آزاد نے ممدوحین کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے اپنے تنقیدی و تحقیقی نظریات بھی بیان کر دیے ہیں اور وہ بھی انتہائی مخلصانہ اور شریفانہ انداز میں کہ قاری کو ناگوار نہ گزرے اور شخصیت نگاری کے فن کی آبرو بھی برقرار رہے۔ ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' کے ایک خاکے میں آزاد لکھتے ہیں:

''جب اُنھوں نے اپنی کتاب ''کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ'' مجھے عنایت کی تو میں نے کہا سروری صاحب اس کتاب کا عنوان رُباعی کا مصرع ہے' بولے جب تک میں تحقیق نہ کرلوں نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا میں بحر اور وزن کے بارے میں زیادہ واقفیت تو نہیں رکھتا لیکن موزوں اور ناموزوں کا فرق جانتا ہوں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ ''کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ'' رُباعی ہی کا مصرع ہے۔ لیکن سروری صاحب کو اس میں شک ہی رہا۔ کچھ مُدت کے بعد ملے تو کہنے لگے کہ فلاں صاحب بھی کہتے ہیں کہ یہ رُباعی کا مصرع ہے' لیکن مجھے ابھی تک اس میں شک ہے۔ اصل میں یہ اُن کی محتاط مزاجی تھی۔ چونکہ رُباعی کے اوزان بحر ہزج کے (کم از کم) چوبیس زحافات میں ہیں، اس لئے اُنھیں رُباعی کے وزن کے بارے میں میری بات فوراً مان لینے میں تامل تھا.....''

(عبدالقادر سروری مشمولہ ''آنکھیں ترستیاں ہیں'')

انگریزی زبان و ادب کی نامور شاعرہ اور فریڈم فائیٹر 'بلبلِ ہند' سروجنی نائیڈو کے فن پر آزاد کا انداز نقد و نظر یوں ظاہر ہوتا ہے:

''اپنی پہلی تصنیف ''طائرِ وقت'' میں آپ نے جو انداز بیاں اختیار

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کیا ہے اُس کے متعلق یہ تنقیدی جُملہ بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ حُسنِ الفاظ اکثر حُسنِ تغزل پر سبقت لے گیا ہے۔ لیکن دوسری کتاب ''سنہری دہلیز'' میں تازگی، بے ساختگی، اور جدّتِ فکر کا عنصر بہت بڑھ گیا ہے اور اِس کتاب میں ارتباطِ حرف و معنی صحیح معنوں میں اختلاطِ جان وتن کی صورت میں نظر آتا ہے۔''

(سروجنی نائیڈو ''معمول'' آنکھیں ترستیاں ہیں'')

''اپنی محفل اپنے دوست'' کے ایک مضمون میں آزاد لکھتے ہیں:

''......جوش اپنی نظم سُنا رہے تھے۔ غالباً عنوان تھا ''سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب''۔ طویل نظم تھی، چالیس پچاس اشعار پر مشتمل۔ تو عرش نے کہا کہ نظم لاجواب ہے اور اس میں خوبی یہ ہے کہ ایک ہی بات کو پچاس بار مختلف انداز سے کہا گیا ہے۔ معلوم نہیں عرش نے یہ بات تعریفی انداز میں کہی تھی یا تنقیصی انداز میں، لیکن جوش یہ سُن کے بولے'' ہاں یہ تو ہمارا خاص فن ہے اور اس خشک فلسفیانہ موضوع کو دلکش بنانے کے لئے اِسے طرح طرح سے بیان کرنا بھی بہت ضروری ہے اور پھر انیسؔ کا یہ مصرع پڑھا:

''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں''

میرے مُنہ سے اتنا ہی نکلا'' لیکن انیسؔ نے یہ مصرع فلسفیانہ شاعری کے متعلق نہیں کہا۔'' ''کس شاعری کے متعلق کہا ہے؟'' جوش صاحب نے سوال کیا۔ میں نے عرض کیا'' فلسفیانہ شاعری میں کمالِ فن ایجاز ہے نہ کہ اطناب، جیسے غالبؔ کی شاعری میں۔'' عرش اور دُسمل بھانپ گئے کہ میں نے مصلحتاً اقبال کا نام نہیں لیا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

یہ دونوں ایسی محفلوں کے مردِ میدان تھے۔ اُنھوں نے کوئی اور
موضوع چھیڑ کے بات کا رُخ بدل دیا۔ کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے تھے
کہ یہ بات چیت جوش صاحب کو پسند نہیں آ رہی تھی۔"

(جوش ملیح آبادی، مرتبہ ڈاکٹر ہلال نقوی "مشمولہ" اپنی محفل اپنے دوست")

اپنے بزرگوں اور دوستوں کی یاد میں لکھتے ہوئے آزاد کے خاکوں میں ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں جن کے حوالے میں نے درج بالا سطور میں دیئے ہیں۔ یہ ایک آخری اقتباس بھی آزاد کی تحقیق، تنقید اور اقبالیات کے حوالے سے خاصا اہم ہے:

"......سرراس مسعود کے انتقال پر علامہ اقبال نے تعزیت کا خط
ممنون صاحب کے نام لکھا اور اس خط میں اس طرح کی بات بھی
لکھی کہ یہ رُباعی جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں میں نے اپنے لوحِ
مزار کے لیے لکھی تھی لیکن مسعود مجھ سے پہلے چلا گیا اس لیے آپ
یہ رُباعی اُن کے لوحِ مزار پر کندہ کرا دیجئے۔ وہ رُباعی یہ ہے:

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
و لیکن کس نہ دانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

مجھے جب ممنون صاحب نے یہ خط دکھایا تو میں نے کہا ممنون
صاحب، آپ کے لیے تو یہ خط ایک بہت قیمتی دستاویز ہے، اوّل سے
آخر تک، لیکن میرے لیے تو یہ اس سے بھی زیادہ بڑا علمی خزانہ ہے۔
اُنھوں نے پوچھا وہ کیسے؟ میں نے کہا بحرِ ہزج کے جس زحاف [1]

---

[1] بحرِ ہزج مثمن سالم محذوف الآخر (حواشی: یعنی "کس" و "اس" ہیں")

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

(مفاعیلن' مفاعیلن' مفاعیل) یا (مفاعیلن' مفاعیلن' فعولن) میں علامہ اقبال نے یہ رُباعی کہی ہے اِسی زحاف میں "پیامِ مشرق" اور "بالِ جبریل" میں اُن کی بیسیوں رُباعیاں موجود ہیں۔ رُباعی کے مروّجہ (TRADITIONAL) زحافات میں جن کی تعداد چوبیس ہے بلکہ اِس سے بھی زیادہ علامہ مرحوم کی صرف چار یا پانچ رُباعیاں ہیں۔ تین اُردو میں اور ایک یا دو فارسی میں[ل] لیکن ان مذکورہ بیسیوں رُباعیات میں سے کسی پر اُنھوں نے "رُباعی" کا لفظ نہیں لکھا اور اس وجہ سے اس زحاف میں کہی ہوئی اقبال کی رُباعیاں ہمیشہ بحث مباحثے کا موضوع رہی ہیں۔ یہ بحث تقسیمِ ہند سے قبل شروع ہوئی اور آج تک جاری ہے۔ اِس سلسلے میں ہمارے اکثر نقاد دوست کہتے ہیں کہ یہ قطعات ہیں رُباعیات نہیں ہیں۔ میرا جواب ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جن میں مطلع موجود ہے (اور زیادہ تر رُباعیات میں مطلع ہے) اُنھیں آپ قطعہ کہتے ہیں تو کہیں اقبال اُنھیں قطعہ نہیں کہیں گے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اقبال کے بیسیوں قطعات میں سے کوئی قطعہ ایسا دکھا دیجیے جس میں مطلع موجود ہو اور اپنی دلیل کو مضبوط بنانے کے لئے میں اِس بات پر بھی مُصر رہا ہوں کہ بابا طاہر عُریاںؔ نے اِس زحاف میں (اور دو اشعار میں) جو کچھ کہا ہے اُسے "رُباعیاتِ بابا طاہر" کہا جاتا ہے۔ معترضین اکثر یہ جواب دیتے ہیں کہ

ل مثلاً "مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع" یا "مفعولن فاعلن مفاعیلن فع" وغیرہ (حواشی بحوالہ "کس دیس بستیاں ہیں")

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کتاب کا نام تو "رباعیات بابا طاہر" ناشرین نے رکھا ہے۔ بابا طاہر نے تو انھیں رباعیات نہیں کہا ہوگا۔ معترضین اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں یہ کتاب اُس وقت بھی اسی نام سے شاملِ نصاب رہی جب مولانا اصغر علی روحی، مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، مولانا تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر محمد اقبال (وائس پرنسپل اورینٹل کالج)، مولانا علم الدین سالک، سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، آغا بیدار بخت اور ڈاکٹر سید عبداللہ ایسے ماہرینِ عروض یونیورسٹی اور کالجوں میں فارسی نظم و نثر پڑھاتے تھے۔ میں تو اس بات کو بھی سند مانتا ہوں کہ ہیرن ایلن نے ان ترجموں پر مشتمل کتاب کا نام "رباعیات بابا طاہر" ہی رکھا ہے۔ جواب دینے والوں کا کہنا یہ ہے کہ ہیرن ایلن نے تو مکھی پر مکھی ماری ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کیا اقبال نے بھی انھیں کہیں رباعیات کہا ہے۔ میرا یہ جواب بھی معترضین کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں کہ "بالِ جبریل" میں کسی غزل کو بھی اقبال نے غزل نہیں کہا ہے۔ "زبورِ عجم" میں ایک سو سے زیادہ غزلیں ہیں لیکن کسی پر لفظ "غزل" لکھا ہوا نہیں ملتا۔ ہاں طویل نظم "گلشنِ رازِ جدید" کے پانچ اشعار پر مشتمل ایک حصے پر لفظ "غزل" لکھا ہے۔ تو جن غزلوں پر انھوں نے غزل کا عنوان نہیں دیا کیا وہ غزلیں نہیں ہیں......"

(یادِ یاراں مہرباں "مشمولہ" کس دیس بستیاں ہیں")

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری پر مشتمل اُن کی تینوں کتابوں سے پیش کیے جانے والے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اس نوع کے بھی اقتباسات اور مثالیں اس امر کی مظہر ہیں کہ جگن ناتھ آزاد فنِ شخصیت نگاری کے شناور ہیں۔ اُن کے خاکے اپنے اندر لفظ و معنی کے کئی جہان بسائے ہوئے ہیں۔ خاکہ نویسی کے اس فن میں وہ اپنے اساتذہ، بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور جان پہچان والوں کے مدح سرا بھی ہیں اور نوحہ خواں بھی۔ جانے والوں کی یاد میں اُن کی آنکھیں نم ہیں اور زندہ شخصیات کی طویل عمر اور صحت و سلامتی کے لئے اُن کے دونوں ہاتھ آسماں کی جانب اُٹھے ہوئے ہیں۔ وہ تخلیق کار بھی ہیں اور محقق و ناقد بھی، اعلیٰ پائے کے نثار بھی اور بلند مرتبت سخن طراز بھی۔ درد آشنا بھی ہیں اور چارہ ساز بھی۔ سادہ کار بھی ہیں اور مرصّع ساز بھی۔ ادبیات کے عالم بھی ہیں اور سماجیات کے آشنا بھی۔ سیاست کے مزاج کو سمجھنے اور برتنے کا ہنر بھی انھیں آتا ہے اگرچہ سیاست اُن کا موضوع نہیں ہے۔ اُن کے شخصی خاکے اوّل درجے کے فن پارے بھی ہیں اور انسانیت کے آئینہ دار بھی اور اس سلسلے میں مزید کئی حوالے دیئے جا سکتے ہیں لیکن طوالتِ مضمون کے پیشِ نظر میں اپنی بات اسی جملے پر ختم کروں گا کہ جگن ناتھ آزاد شخصیت نگاری کی اُس توانا روایت کی ایک معیاری کڑی ہیں جس روایت سے محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، عبدالمجید سالک اور رشید احمد صدیقی ایسے بڑے نام وابستہ ہیں۔

(غیر مطبوعہ کتاب "آزادنامہ" کا ایک باب)

(۲۰ رجولائی ۲۰۰۳ء)

XXX

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

امین بنجارا اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

حکیم صاحبِ عالم

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا۔ اُدھر سے آواز آئی "میں ہمایوں ظفر زیدی بات کر رہا ہوں عمان سے....." میں بات سُنتا رہا۔ وہ مجھے ازراہِ کرم عمان آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ساتھ ہی میرے تحت الشعور سے ایک خاموش آواز آ رہی تھی کہ میں اس نام سے شناسا ہوں۔ لیکن شعوری طور پر میری توجہ اُس آواز کی طرف تھی جو عمان سے آ رہی تھی۔ آٹھ دس منٹ میں بات چیت ختم ہو گئی اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ ان کا نام کہاں پڑھا ہے کہاں سُنا ہے لیکن یہ عُقدہ نہ سُلجھی۔ اُنھوں نے بات چیت میں حکیم صاحبِ عالم مرحوم کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ اُن کے نانا تھے۔ میں نے جواب میں بتایا کہ میں اُن کا نیاز حاصل کر چکا ہوں۔ لکھنؤ میں اُن کے دولت کدے پر اور کچھ ایسا خیال ہے کہ اُن سے ملاقات ایک سے زیادہ بار ہوئی ہے اور ساتھ ہی میں نے یہ بھی بتا دیا کہ چند دن ہوئے عمر کے ۸۳ ویں برس میں قدم رکھا ہے۔ اب حافظہ پوری طرح کب تک اور کہاں تک ساتھ دے۔

دُوسرے دن تک حکیم صاحبِ عالم کے متعلق تو یادیں کسی حد تک تازہ ہوتی چلی گئیں لیکن

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ماضی میں کریدنے کے باوجود حافظے نے یہ بات نہ بتائی کہ ہمایوں ظفر زیدی کے بارے میں میرا یہ خیال کیوں ہے کہ میں اس نام سے آشنا ہوں۔

ہمایوں صاحب نے حکیم صاحب عالم کے بارے میں کچھ لکھنے کی بھی فرمائش کی' میری یادوں کی بنا پر' لیکن میں دو چار روز تک اسی خیال میں گم رہا کہ ہمایوں ظفر زیدی کا نام میرے تحت الشعور میں کیوں موجود ہے۔ ملاقات تو اُن سے تھی نہیں اس لیے ملاقات کیونکر یاد آتی۔ اس نام کے تعلق سے کوئی نظم یا نثر کا حصہ بھی یاد نہ آیا ——— لیکن دو چار دن ہی میں یہ گتھی سُلجھ گئی اور اس کا سبب ایک ہلکا سا گمان بنا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے سرور صاحب پر جو سوڈ نیر مرتب کیا ہے ''تحفۂ السرور'' کے نام سے غالباً اس میں ہمایوں ظفر زیدی کے نام سے سرور صاحب کے بارے میں ایک انگریزی تحریر موجود ہے۔ فوراً ہی اپنے ذخیرۂ کتب میں سے ''تحفۂ السرور'' نام کا کتابچہ نکالا۔ اس کی ایک ہی جگہ پر دو کاپیاں رکھی تھیں۔ کھول کے دیکھا تو اپنا اندازہ صحیح نظر آیا ——— مجھے خداوند کریم نے کچھ ایسا مزاج عطا کیا ہے کہ اگر کسی علمی و ادبی مسئلے میں کوئی اُلجھن پیدا ہو جائے تو جب تک وہ اُلجھن حل نہ ہو جائے کسی اور علمی و ادبی کام کی جانب توجہ مبذول نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب یہ عقدہ حل ہو گیا تو زیدی صاحب کے ساتھ کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ میں حکیم صاحب عالم مرحوم کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ لکھ کے آپ کو بھیجوں گا۔

۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ جوش ملیح آبادی پبلی کیشنز ڈویژن (منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ) کے شعبۂ اُردو میں ایڈیٹر مقرر ہو کر آئے اور راقم التحریر' عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ کا بھی اسی شعبے میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر تقرر ہوا۔ بلونت سنگھ کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے دفتر میں بھی جوش صاحب کے ساتھ اُن کی ملاقات کم ہی ہوتی تھی۔ عرش کو اور مجھے جب موقع ملتا تھا ہم جوش صاحب کے چیمبر میں گھس جاتے تھے۔ وہاں اوّل تو پہلے ہی سے محفل جمی ہوتی تھی۔ مقامی شعراء اور اہلِ قلم کے علاوہ باہر سے وہاں آئے ہوئے شعراء بھی اکثر موجود ہوتے تھے۔ اگر کوئی نہ ہو تو میں اور عرش ملسیانی ہی جوش صاحب کے سامعین بن جاتے تھے اور اُن کی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نثر سے، گپ شپ سے، لطائف سے محظوظ و مستفید ہوتے تھے۔ وہ جو حالی نے غالب کے بارے میں کہا ہے کہ

ع - اُس کی تھی بات بات میں اِک بات'

'وہ بات جوش صاحب میں بھی موجود تھی۔ اکثر و بیشتر وہ اپنا نیا کلام اُس محفل میں بھی سُنا دیتے تھے جو اُن کے چیمبر میں جمتی تھی۔

یہاں یہ بتا دینا بھی نامناسب نہیں ہے کہ جوش صاحب کی بدولت دہلی میں دو قسم کی ادبی محفلیں جمتی تھیں۔ ایک تو اُن کے چیمبر میں جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ دُوسرے اُن کی شبینہ محفلیں جن میں میزبان دُوسرے لوگ ہوتے تھے یعنی اُردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حکومت کے بڑے افسر یا وہ رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ والے عاشقانِ اُردو جو بڑی بڑی مہمان نوازیوں کا بوجھ بآسانی اُٹھا سکتے تھے۔ اور مہمانِ خصوصی جوش صاحب ——— بلونت سنگھ تو خیر ان محفلوں میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ ان میں عرش بھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ عرش کو جب میں نے شروع شروع میں ان محفلوں سے غیر حاضر پایا تو اُن سے ان نادرِ روزگار محفلوں سے غیر حاضر ہونے کا سبب پوچھا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ دیکھو آزاد! میں نہ شراب پیتا ہوں نہ گوشت کھاتا ہوں۔ میں ان محافل میں شریک ہو کے کیا کروں گا۔ میں نے کہا دیکھئے عرش صاحب! وہاں شراب و کباب کے علاوہ کھانے کو گھاس پھوس بھی تو بہت ہوتا ہے۔ پنڈت ہری چند اختر بھی تو وہیں ہیں وہ بھی شریک ہوتے ہیں! اُن کے علاوہ میں نے چند اور اہلِ قلم و ادب حضرات کا نام لیا اور کہا کہ ان شرکائے بزم کی بدولت ان محفلوں کا ادبی معیار بہت اُونچا رہتا ہے۔ ادبی گپ شپ جو اس دور میں مفقود ہوتی چلی جا رہی ہے وہاں اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض مقامی شعراء اور نثر نگاروں کا میں نے ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ پاکستان سے اور دُنیا کے مختلف حصّوں سے بھی بعض ایسے مدعو حضرات ان محفلوں میں تشریف لاتے ہیں جن کی دہلی میں آمد کا انعقادِ محفل سے قبل ہمیں علم بھی نہیں ہوتا۔ لیکن عرش ٹس سے مس نہ ہوئے اور جواب

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میں اتنا ہی کہا کہ "نمی ارزد" ——— اور میں نے اس موضوع کو اُن کے ساتھ دوبارہ کبھی نہیں چھیڑا۔

اب صورت یہ تھی کہ جوش صاحب کے تین دفتری رفقاء میں واحد شخص راقم التحریر ہی تھا جو اُن کا قریب ترین رفیق تھا ——— ایک جونیئر نیاز مند رفیق۔ اس بات کا ذکر بھی جوش صاحب نے اپنے کسی دوست کے نام خطوں میں کیا ہے' کچھ اس طرح سے کہ عرش تو میرا دن کا رفیق ہے جگن ناتھ دن اور رات کا رفیق ہے۔

یہ اُوپر کے پیراگراف میں جو کچھ میں نے عرض کیا اس کی حیثیت ہے تو "جملہ معترضہ" کی لیکن جس موضوع کے پیشِ نظر میں نے یہ تحریر شروع کی ہے اُس سے یہ لاتعلق بھی نہیں ہے بلکہ خاصی حد تک (میرے نزدیک پوری طرح سے) وابستہ ہے۔

۱۹۴۸ء کی بات ہے جوش صاحب اور میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں مدعو تھے۔ غالباً ریڈیو کا مشاعرہ تھا۔ لکھنؤ میں جوش صاحب کا اور راقم التحریر کا قیام ایک ہی ہوٹل میں تھا۔ ہم دونوں ناشتے سے فارغ ہوئے تو جوش صاحب نے فرمایا کہ ریڈیو کا مشاعرہ تو کل ہے' گویا آج کا دن اور کل کا دن غروبِ آفتاب تک' یہ دو دن ہمارے پاس ہیں' یہ سارا وقت پرانے دوستوں سے ملنے میں صرف ہونا چاہئے۔ میں نے بھی ہامی بھری کہ آپ اپنے احبابِ لکھنؤ کا ذکر دفتر میں ہم لوگوں کے ساتھ اکثر کیا کرتے ہیں۔ آپ کی بدولت میں بھی اُن حضرات کی زیارت کرلوں گا ——— میں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "اگر کسی صاحب کا ٹیلی فون نمبر آپ کو یاد ہو تو انھیں ٹیلی فون پر اطلاع دی جا سکتی ہے ورنہ....." یہاں تک کہہ کے میں تو خاموش ہو گیا اور جوش صاحب نے سوال کیا "ورنہ کیا؟" میں نے کہا ملاقات کی یا اطلاع کی کوئی اور صورت پیدا کرلی جائے گی۔ بولے "کون سی صورت؟" میں نے عرض کیا کہ آپ کے بعض احباب کے پتے آپ کو معلوم ہوں گے۔ بعض کے مجھے معلوم ہیں۔ یہ پتے لکھ کے ہوٹل کے کسی ملازم کو دیں گے۔ وہ رکشا میں جائے گا اور سب کو جو بھی پیغام دینا ہے دے کے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

آجائے گا۔ ہم اُسے اِس خدمت کا عوضانہ دے دیں گے۔ اس سے قبل ٹیلی فون ڈائرکٹری میں بعض حضرات کے ٹیلی فون نمبر دیکھ لیتے ہیں۔ جوش صاحب نے ایک لمبی "ہوں" کی اور کہا کہ کاغذ پنسل لائیے اور نام لکھئے' پتے میں آپ کو لکھواتا ہوں۔ میں کاغذ پنسل لے کے بیٹھا تو مجھ سے اُنھوں نے سوال کیا کہ سب سے پہلے کن کا نام لکھا جائے؟ میں نے کہا کہ "آپ دفتر میں ہم لوگوں سے بات چیت کرتے وقت جس شخصیت کا نام بڑی محبت اور بڑے احترام سے لیا کرتے ہیں وہ تو حکیم صاحب عالم ہیں۔ ان کے بعد....." جوش صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ[1] نے میرے دل کی بات کہی ہے۔ اب "بعد وعد" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف حکیم صاحب عالم ہی سے بات کریں گے۔"

اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ ملازم کے ہاتھ پرچہ لکھ کے بھیجا گیا یا جوش صاحب نے ٹیلی فون پر بات کی لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ تھوڑی ہی دیر میں حکیم صاحب عالم ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ بڑے تپاک کے ساتھ جوش صاحب سے ملے۔ میں نے آداب کہہ کے اپنا تعارف کرایا۔ جوش صاحب نے میرے بارے میں بہت اچھے الفاظ کہے اور یہ بھی بتایا کہ میں نے آزاد سے پوچھا کہ سب سے پہلے اپنی آمد کی اطلاع کس دوست کو دی جائے تو آزاد نے مجھے میری ہی باتیں یاد دلا کے آپ ہی کا نام تجویز کیا۔ ظاہر ہے اس بات سے حکیم صاحب عالم کو کتنی مسرت ہوئی ہوگی۔

جوش صاحب نے ملازمت تو پبلی کیشنز ڈویژن میں آنے سے پہلے بھی کی تھی۔ ریاست حیدرآباد کی حکومت کے دارالترجمہ میں وہ مترجم رہے۔ غالباً ریاست اُلور اور ریاست پٹیالہ میں بھی انھیں پنشن ملتی رہی۔ لیکن پبلی کیشنز ڈویژن کی ملازمت اُن سب سے ارفع تھی۔

---

[1] جوش صاحب مرحوم کے ساتھ اپنی نو دس برس کی رفاقت میں یہ بات خاص طور سے میں نے دیکھی کہ وہ اپنے سے چھوٹوں' خوردوں اور جونیئر نیاز مندوں سے بھی "تم" کہہ کے خطاب نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ "آپ" کہتے تھے۔ یہی بات میں نے جگر صاحب مرحوم میں بھی دیکھی۔ ہاں فراق صاحب اپنے خوردوں کو بھی غلطی سے "آپ" کہہ دیں تو الگ بات ہے ورنہ وہ ہمیشہ "تم" ہی کے لفظ سے خطاب کرتے تھے۔ (ج ن ا)

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ملازمت کہاں تھی' افسری تھی۔ ادبی نوعیت کا کام اور وہ بھی راقم التحریر، عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ نے سنبھال رکھا تھا۔ میرے لیے تو ایک خزانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ماہنامہ "بساطِ عالم" کے لئے موصول شدہ مضامین کو ایک نظر دیکھ کے کاتب کو دینا، کتابت کے بعد ان کے پروف پڑھنا اور تصحیح شدہ پروفوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انھیں پریس کے حوالے کرنا۔ اب کام ختم اور جوش صاحب کی محفل میں حاضری ——— تو جوش صاحب حکیم صاحب عالم کو اپنی نئی ملازمت کے بارے میں ہر چھوٹی بڑی بات بتاتے رہے۔ میری' عرش صاحب کی اور بلونت سنگھ کی تعریف بھی انھوں نے کی کہ رُفقاء بہت اچھے ملے ہوئے ہیں۔ اسی بات چیت کے دوران میں جواہر لعل نہرو کی تعریف بھی دو ایک بار اُن کی زبان پر آئی۔ (ویسے ضابطے کے پیشِ نظر جوش صاحب کا اور ہم تینوں کا تقرر یونین پبلک سروس کمیشن نے کیا تھا)۔

حکیم صاحب عالم نے بھی اپنے حالات اور حالات کے اُتار چڑھاؤ کے بارے میں انھیں بہت کچھ بتایا۔ انھوں نے ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان جانے کی طرف بھی اشارہ کیا لیکن جوش صاحب نے اُن سے نصیحتہً یہ کہا کہ آپ کو لکھنؤ چھوڑ کے کہیں نہیں جانا چاہئے۔ (جوش صاحب کو اُس وقت یہ کہاں خیال آیا ہوگا کہ ایک دن وہ خود ہندوستان چھوڑ کے پاکستان چلے جائیں گے) لکھنؤ تو جوش صاحب کا محبوب ترین شہر تھا اور جب لکھنؤ کے لیے محبت کا جذبہ اُن کے دل میں اُبھرتا تھا تو وہ "ہائے لکھنؤ" کہہ کے لکھنؤ کو یاد کرتے تھے۔

حکیم صاحب عالم نے جوش صاحب کو رات کے کھانے کی دعوت دی اور ساتھ ہی مجھے بھی اور اس کے ساتھ ہی یہ مژدۂ جانفزا بھی دیا کہ جوش صاحب کے بعض اور احباب بھی کھانے پر تشریف لائیں گے۔ اس خوش خبری نے میرے دل میں شریکِ دعوت ہونے کا اشتیاق اور بڑھا دیا۔

شام کو جوش صاحب جب شغلِ نائے نوش سے فارغ ہوئے تو حکیم صاحب عالم کی بھجوائی ہوئی گاڑی آ چکی تھی۔ وہ گاڑی ہم دونوں کو ہوٹل سے حکیم صاحب عالم کے دولت کدے پر لے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

گئی۔ وہاں جا کے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مکمل شعری نشست کا اہتمام موجود ہے۔ آنند نرائن مُلّا، مانی جائسی، احتشام حسین، سراج لکھنوی، مخمور لکھنوی، مسعود حسن رضوی، قدیر لکھنوی اور خود صاحب خانہ حکیم صاحب عالم۔ یوں تو مجھے اُن تمام حضرات سے ملاقات کر کے دلی مسرت ہوئی لیکن میں اس تصور سے کچھ گھبرا بھی گیا کہ اگر ان اساتذہ کے سامنے مجھے اپنا کلام پڑھنا پڑا تو میں کیا پیش کروں گا۔ مشاعرے میں کلام پڑھنے کی بات کچھ اور تھی اور میں لکھنؤ گیا بھی تو ریڈیو کا مشاعرہ پڑھنے لیکن مشاعرے کی بات یہ ہے کہ

ع - 'بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی'

لیکن یہ تو تمام اہلِ نظر حضرات تھے۔ تماشائی ایک بھی نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اس محفل شعراء نے اگر شعری نشست کی صورت اختیار کی تو سب سے پہلے مجھے ہی پڑھنا ہوگا کیونکہ میں ہر اعتبار سے سب سے جونیئر تھا۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ حکیم صاحب عالم نے ہم سب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جوش صاحب کا کلام سُنے ہم سب کو بڑی مُدت ہوگئی ہے۔ اُن کا کلام سُننے کے لئے آج کے تمام مہمان منتظر ہوں گے لیکن ظاہر ہے کہ جوش صاحب کے کلام پڑھنے کی باری تو اُس وقت آئے گی جب تمام شعراء حضرات اپنا اپنا کلام سُنا چکیں گے۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ یہ اعلان سُن رہا تھا اور ڈر یہی تھا کہ شروع میں مجھے پڑھنا ہوگا۔ میں انھی خیالوں میں غرق تھا کہ احتشام صاحب نے فرمایا اس نشست کا آغاز جگن ناتھ آزاد ہی کریں گے۔ میں نے چند روز قبل اُن کی ایک غزل اسی ہفتے دلی ریڈیو سے سُنی ہے۔

ع - 'نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری'

میری گزارش ہے کہ آزاد یہی غزل سُنائیں۔ میں نے بڑے احترام سے احتشام صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نے "گزارش" کا لفظ استعمال کر کے میرے لبوں پر مہرِ خاموشی لگا دی ہے۔ آپ کی کتابیں پڑھ کے میں نے شعر کہنا اور نثر لکھنا سیکھا ہے۔ اس لیے اب میری گزارش یہ ہے کہ آپ "گزارش" کے لفظ کی جگہ "فرمائش" کا لفظ استعمال فرمائیں۔ احتشام صاحب نے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میری بات مان کے فرمائش کی اور میں نے یہ غزل پڑھی۔ اب اس سے قبل کہ میرے بعد کسی اور شاعر کے لیے حکیم صاحب عالم فرمائش کریں رضوی صاحب نے احتشام صاحب سے خطاب کرتے ہوئے کہا' احتشام صاحب' آپ نے یہ غزل دلّی ریڈیو سے ایک ہفتہ قبل سُنی ہے اور میں نے آزاد کی زبانی ایک طویل نظم کے پانچ سات اشعار ایک ماہ قبل لاہور ریڈیو سے سُنے ہیں۔

ع - 'تری بزم طرب میں سوز پنہاں لے کے آیا ہوں'

چنانچہ اُن کی فرمائش پر میں نے یہ اشعار بھی پڑھ دیے۔ یہ بھی مذکورہ غزل کی طرح پسند کیے گئے۔

یہ سب کچھ میں نے لکھ تو دیا ہے لیکن اس بات سے مجھے خاصی اُلجھن ہو رہی ہے کہ جب یہ مقالہ کہیں چھپے گا یا میں کہیں پیش کروں گا تو قارئین یا سامعین یقیناً یہ کہیں گے کہ عجیب مقالہ نگار ہے جس نے اپنے کلام کا تو ذکر کر دیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ دوسرے شعراء نے کیا پڑھا۔ اب یہاں اس کے سوا میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس واقعے کو ترپن برس ہو گئے ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ۔ اپنے اشعار تو اس لیے یاد رہ گئے کہ میں لکھنؤ میں پہلی بار اپنا کلام پڑھ رہا تھا' اُستادانِ فن کے سامنے۔ تمام حضرات نے اپنا اپنا کلام پڑھا۔ سب کو بے پناہ داد ملی۔ حکیم صاحب عالم کا شمار اُن شعراء میں تھا جن کا کلام دوبارہ سُنا گیا۔ لیکن اس وقت مذکورہ اساتذۂ سخن کی کسی غزل کا کوئی مصرع یاد نہیں۔ ہاں! اتنا یاد ہے کہ حکیم صاحب عالم نے اپنی ایک نعتیہ غزل پڑھی تھی۔ اُن کی ایک غزل اس وقت بھی میرے سامنے ہے جس پر کسی مختلف قلم سے ''نعتیہ غزل'' لکھا ہے۔ لیکن یہ وہ غزل نہیں ہے جو اُس وقت اُنھوں نے پڑھی تھی۔

یہ غزل جو اس وقت میرے سامنے ہے اُن کی قادر الکلامی کی ایک روشن مثال ہے۔ یہ ساری غزل نعتیہ نہیں ہے اس میں چار اشعار نعت کے ہیں۔ باقی اشعار میں تغزل کی کمی نہیں ہے لیکن وہ نعت کے اشعار نہیں ہیں۔ اس غزل کا ایک نعتیہ شعر دیکھئے جس میں اُنھوں نے استعارے اور علامت کے ذریعے سے مضمونِ شعر کو کہاں سے کہاں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

پہنچا دیا ہے ۔

دیکھئے ہوتا ہے کیا حسرتِ نظارہ کا حشر
جلوے اَب طالبِ دیدار تک آ پہنچے ہیں

اسی مضمون کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ۔

دیکھئے مِلتی ہے کیا ان کی بہا محشر میں
گوہرِ اشک خریدار تک آ پہنچے ہیں

یہ شعر بھی تشبیہ اور استعارے کے حُسن کی بدولت گوہرِ آبدار کی طرح چمک رہا ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع حکیم صاحب عالم نے دو طرح سے کہا ہے۔ اس کی دُوسری صورت یہ ہے:

ع - دیکھئے مِلتی ہے کیا ان کی بہا قسمت سے

غالباً وہ یہ طے نہیں کر سکے کہ دونوں میں بہتر مصرع کون سا ہے۔ اَور جب اس امر پر میں غور کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ دونوں مصرعے ہر اعتبار سے فنی خوبصورتی کی مثال ہیں اس لئے ایک کو دُوسرے پر ترجیح دینا واقعی مُشکل ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے غزل میں تمام اشعار نعتیہ نہیں ہیں۔ دو اشعار میں نے اُوپر درج کئے ہیں۔ ایک اور شعر قارئین ملاحظہ فرمائیں ۔

لذتیں راہِ طلب کی کوئی اُن سے پوچھے
گرتے پڑتے جو درِ یار تک آ پہنچے ہیں

مُجھے معلوم نہیں حکیم صاحب عالم نے روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ کا سفر کیا ہے یا نہیں لیکن اگر جسمانی طور پر یہ سفر نہیں بھی کیا تو بھی اپنے تصور میں یہ سفر کر چکے ہیں ورنہ اس طرح کے شعرِ آبدار کا معرضِ وجود میں آنا ممکن نہیں تھا۔ علامہ اقبال نے بھی تو مکّہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر تصوّر ہی کے عالم میں کیا ہے اور اس طرح کے اشعار جنھیں درخشندہ فلزّات کہا جا سکتا ہے ہمیں دیئے ہیں ۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج
کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی

بادی النظر میں اس شعر کے مفہوم تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ جب ہم اس کی گہرائی میں اُترتے ہیں تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ مقامِ سپردگی کی انتہا ہے۔ اس شعر کا مفہوم اقبال کے اس شعر ؎

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بے باکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر فکر نہیں بے باک

میں پنہاں ہے۔

تو میں یثرب کے تصور میں سفر کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں اقبال کی یہ رُباعی ملاحظہ کیجئے ؎

بہ ایں پیری رہ یثرب گرفتم — نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں طائر کہ در صحرا سرِ شام — کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

یقین کامل ہو اور جذبہ صدق و صفا کی دولت سے معمور ہو تو جسمانی سفر اور باطنی سفر میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

اب حکیم صاحب عالم کی اسی غزل کا ایک اور نعتیہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

دُور اب کچھ بھی نہیں منزلِ عرفاں ساقی!
رند تیرے رسن و دار تک آ پہنچے ہیں

یہ شعر خاصی گہری معنویت کا حامل ہے فکر اور جذبے کے مقامِ اتصال سے اُبھر کر صفحۂ قرطاس پر آیا ہے۔ رسن و دار تک پہنچنا وحدت الوجودی فلسفے کی انتہا ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کی یہی انتہا منصور حلاج کو رسن و دار تک لے گئی تھی اور "رسن و دار" اب ہماری اُردو اور فارسی شاعری کی ایک زندہ جاوید روایت بن چکی ہے۔ مذکورہ بالا شعر اس زندہ روایت کا ایک زندہ نمونہ ہے۔

نعت لکھنا پُل صراط سے گزرنے کا عمل ہے۔ راقم التحریر کی نظر سے اکثر ایسی نعتیں گزری

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہیں جن کے لکھنے والے شعراء نے نعت کے حدود کی پابندی نہیں کی۔ ایسی نعتیں پڑھ کے جن کے شعراء نے نعت کی حدود کی پابندی کئے بغیر اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے مجھے عزت بخاری کا یہ شعر اکثر یاد آجاتا ہے ۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

حکیم صاحب عالم کے وہ اشعار جو تغزل کی ذیل میں آتے ہیں ایک ایسے سچے اور کھرے شاعر کے جذبہ دل کی تخلیقات ہیں جس نے روایت کا احترام کیا ہے۔ ماضی پرستی نہیں کی بلکہ ماضی کے آئینے میں حال کا جائزہ لیا ہے اور مستقبل کا مشاہدہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اُردو کو صرف زبان ہی نہیں سمجھا بلکہ زبان کے ساتھ تہذیب بھی سمجھا ہے۔ اُنھوں نے بطور شاعر کے اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

جہاں تک حکیم صاحب عالم کی شخصیت اور شاعری کا تعلق ہے میں نے بات جوش ملیح آبادی مرحوم کے ذکر سے شروع کی تھی۔ ایک بار پھر میں اُسی مقام پر واپس جانا چاہتا ہوں۔ جوش جب کسی شاعر کی تعریف کریں شخصیت کی بھی اور شاعری کی بھی تو پھر راقم الحرف کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

جب جوش صاحب کو حکیم صاحب عالم کے انتقال پر ملال کی خبر ملی تو اُنھوں نے وفورِ درد کے عالم میں ایک طویل مضمون حکیم صاحب عالم کے بارے میں لکھا۔ جب اس سے بھی اُن کے قلبِ محزوں کی تشفی نہ ہوئی اور اُنھیں حکیم صاحب کے انتقال کے بعد اپنی زندگی رائگاں نظر آنے لگی تو اُنھوں نے اپنا مرثیہ لکھا اور اس میں جس خونچکاں دل سے صاحب عالم کی موت پر اظہارِ ماتم کیا اس کی مثال راقم الحرف کو اُردو شاعری میں اور کہیں نظر نہیں آئی۔

پہلے حکیم صاحب کی موت پر جوش صاحب کے افکارِ نثر پر ایک نظر ڈالئے۔

آپ لکھتے ہیں:۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

"صاحب عالم تم نے مجھ سے بڑی دغا کی۔ مجھ پر بڑا قہر ڈھایا۔ خود سدھار گئے اور مجھے اس بیگانہ دنیا میں چھوڑ دیا کہ سر پٹکتا پھروں۔ میری اس منزلِ عمر میں جب کہ نئے احباب کا پیدا ہونا امکان سے خارج ہو چکا ہے۔ میری کشتیِ حیات کے بادبان کھول دیئے جا چکے ہیں اور "جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا" کی صبح طالع ہونے والی ہے' تمہارا روپوش ہو جانا بالکل ایک ایسا ہی سانحہ ہے جیسے اندھیری رات کے وقت کوئی دوست اپنے رفیقِ سفر کو جنگل میں چھوڑ کے روپوش ہو جائے۔"

جوش صاحب کی جس نظم "اپنا مرثیہ" کا میں نے اوپر کی سطور میں ذکر کیا ہے اب اس کا ایک پورا بند ملاحظہ ہو۔

مورّخ تھے جو میری زندگی کے — اُنھی یاروں کو چُن چُن کر اُٹھایا
مجھے اندھا بنا دینے کی خاطر — چراغِ صاحبِ عالم بجھایا
صنم تھا جو برے دینِ وفا کا — مجھے اُس یارِ جانی سے چھڑوایا
جو اپنی ذات سے اک انجمن تھا — فلک نے خاک میں اُس کو ملایا
مری خاطر جو مسجد سے نکل کر — خراباتِ مغاں میں جگمگایا
جو میری ہمنشینی کی لگن میں — کسی خطرے کو خاطر میں نہ لایا
مرے شعلوں سے کھیلا اور برسوں — مگر تا عمر دامن کو بچایا
ستمگر زندگی' تو نے بالآخر — مجھے اُس کے جنازے کو دکھایا
اُداسی پر مری دشمن بھی تڑپے — مشیت کو ترس لیکن نہ آیا

نظر آئیں مجھے تا دور قبریں
جو ماضی کے چراغوں کو جلایا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

حکیم صاحب عالم کے انتقال پر صرف جوش ملیح آبادی ہی خون کے آنسو نہیں روئے' اردو دُنیا دُور دُور تک ایک ماتم کدہ بن گئی۔ مانی جائسی نے عزیز لکھنوی کے اس شعر ؎

ہمسفیران چمن سب اُڑتے جاتے ہیں عزیز
اب تمھیں بھی مائلِ پرواز ہونا چاہیے

کو عنوانِ فریاد بنا کر ایک طویل مقالہ سپردِ قلم کیا جس میں آپ لکھتے ہیں:-

''سرزمینِ پاکستان خوش نصیب ہے کہ جس میں انسانیت کا یہ خزانہ بے بہا مدفون ہوا ـــــــ یہ پاکستان کو کیا روانہ ہوئے مُلکِ عدم کی سیر کو چلے۔ آہ! اس سفر کے بعد پھر نہ ملے۔ اُن کے فیوض سے دُنیا کی محرومی دردانگیز سانحہ' اور میرے ایسے مخلص سے ہمیشہ کے لیے' کم سے کم میری زندگی بھر کے لیے جُدا ہو جانا ماتم خیز رُوداد ہے۔''

ہندوستان سے پاکستان تک پھیلا ہوا یہ غمکدہ نہ جانے کتنی شخصیتوں پر مشتمل ہے۔ اُن میں حکیم صاحب عالم کے احباب بھی شامل ہیں' رشتہ دار بھی' اُن کے قدر دان شاعر اور نثر نگار بھی' وہ بھی جو اُن کے زیرِ علاج رہے۔ اب اُن تمام کا مفصل ذکر کرنا تو اس مقالے میں سما نہیں سکے گا۔ ہاں بعض کے اسمائے گرامی درج ہیں جن کے قلم نے صفحۂ قرطاس پر اپنے آنسو گرا کر ان کی روشنی میں حکیم صاحب عالم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ ان میں علامہ سیّد اختر علی مہدی، سیّد قلب مصطفےٰ، سیّد محمد نقوی صاحب سرسوی، حاجی سیّد غلام حسین صاحب نقوی اور سیّد مرتضےٰ حسین صاحب صدر الافاضل نے مرحوم کو نثر میں خراجِ تحسین ادا کیا ہے تو جناب ریاض جسر ولی اور جناب قمر لکھنوی نے شعر کہہ کے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ شعرائے سرسی نے حکیم صاحب عالم کے انتقالِ پُر ملال پر قطعاتِ تاریخ موزوں کر کے حکیم صاحب سے اپنی عقیدت ہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اشعار میں تاریخ نکال کے اُردو شاعری پر بھی احسان کیا ہے۔ اس دور میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

جب مصرعِ تاریخ نکالنے کا رواج کم ہوتا جارہا ہے انھوں نے ماضی میں گم ہوتی ہوئی ایک صنفِ سخن کو حیات نو بخشی ہے۔ یہ اپنے مرحوم دوست کے تئیں اظہارِ عقیدت کرنے والے اور صنفِ تاریخ گوئی پر احسان کرنے والے شعراء ہیں مثلاً سید حسن جان صاحب حسن، ہندی کے شاعر شری اوم پرکاش صباادمی، سید محمد سبطین سروش، سید تقی احمد صاحب تقی، مولوی سید ہاشم علی صاحب ہاشم، سید نفیس الحسن اطہر، سید حسین الزماں حسین، سید امانت حسین صاحب امانت، سید نواب حسن بیدل، مولوی سید علی ہادی جوہر، جناب ناصر حسین ناصر، مولوی سید محمد ہادی صاحب ہادی، سید محمد نقوی سید، سید مجاہد حسین صاحب حسینی، بمبئی۔

اب جب کہ یہ تحریر قریب الاختتام ہے مجھے غالب کا یہ مصرع یاد آرہا ہے

ع - 'ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے!'

لیکن میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنی اس تحریر کو اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پر ختم کروں اور ہمایوں ظفر زیدی کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے مجھے حکیم صاحب عالم کی ذات وصفات پر لکھنے کا موقع بہم پہنچایا۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیٔ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ساحر لدھیانوی

تقسیمِ ہند سے قبل ساحر کے ساتھ لاہور میں میری ملاقات تو اکثر ہوئی لیکن ہم دونوں میں دوستی بہت بعد میں آ کے شروع ہوئی۔ لاہور میں اُن کے جو دوست تھے اُن میں شورش کاشمیری، گوپال متل، پرکاش پنڈت، رام پرکاش اشک اور دیوندر ستیارتھی کے نام سرِ فہرست ہیں۔ چودھری نذیر احمد بھی اُن کے دوستوں میں ہوں گے، چودھری برکت علی بھی اور فکر تونسوی بھی۔ لیکن قیامِ لاہور کے زمانے تک مجھے ساحر کے ساتھ یہ قُرب حاصل نہیں ہوا تھا۔

ساحر کی شہرت ''تاج محل'' کی اشاعت کے ساتھ ہی بامِ رفعت پر پہنچ گئی تھی۔ بالخصوص یہ شعر تو اُس زمانے میں ہر اُردو پڑھے لکھے کی زبان پر تھا۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

یہ نظم مجھے بہت پسند تھی۔ ایک دن کی بات ہے کنھیالال کپور کے ساتھ اس نظم کا ذکر ہو رہا تھا۔ کنھیالال کپور میرے دوست بھی تھے اور پڑوسی بھی۔ اُنھوں نے کہا بڑی لغو نظم ہے۔ اب کپور کی بات یہ ہے کہ اکثر اُن کے ساتھ دورانِ گفتگو میں مجھے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ اِس وقت

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سنجیدگی سے بات کر رہے ہیں یا طنز و مزاح کے موڈ میں ہیں۔ خود میری بعض نظموں اور غزلوں کا ذکر وہ میرے ساتھ اس طرح سے کرتے تھے کہ میں چکرا جاتا تھا۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا تعریف کر رہے ہیں یا طنز کا نشتر چلا رہے ہیں۔ چنانچہ جب ''تاج محل'' کے بارے میں اُنھوں نے کہا کہ انتہائی لغو نظم ہے تو میں سمجھا یہ بات وہ اَز راہِ مذاق کہہ رہے ہیں لیکن کپور اُس وقت سنجیدہ تھے۔ چنانچہ اپنی اس رائے کے ساتھ ہی کہ انتہائی لغو نظم ہے اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ ساحر غالباً یہ چاہتے ہیں کہ شاہ جہاں سنگِ مرمر کا مقبرہ بنانے کی بجائے اُسی روپے سے مزدوروں کے لئے دس لاکھ جھونپڑے بنا دیتا۔ میں نے کہا کپور صاحب میں آپ کا اعتراض نہیں سمجھا۔ تو کپور نے نظریہ فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت یوں کی کہ یہ لوگ کمیونسٹ بنے پھرتے ہیں۔ لیکن کمیونزم کے بارے میں ان کا مطالعہ صفر سے زیادہ نہیں ہے۔ ''تاج محل'' فن کا ایک نمونہ ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ شاہ جہاں نے دولت کے سہارے غریبوں کی محبت کا مذاق اُڑایا ہے صرف فن ہی سے ناواقفیت کی دلیل نہیں بلکہ اشتراکی نظریہ حیات سے بھی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ کپور کی بات کچھ میری سمجھ میں آئی، کچھ نہ آئی۔ میں نے کہا کہ نظم کا صوتی آہنگ وجدان کو بے ساختہ متاثر کرتا ہے۔ کپور نے پھر طنز کا نشتر چلایا کہ تم مولانا تاجور اور آقا بیدار بخت کی صحبت میں زیادہ رہتے ہو۔ تم ابھی تک صوتی آہنگ سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اب یہ بات تو صحیح تھی کہ میں مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم کا شاگرد تھا اور اُن کے فیضِ نظر سے پُرانی کلاسیکل شاعری کی روایات میرا جزوِ مزاج بنتی چلی جا رہی تھیں۔ لیکن کپور کی زبان سے یہ سُن کر کہ تم ابھی تک صوتی آہنگ سے آگے نہیں بڑھ سکے، مجھے حیرت بھی ہوئی اور دُکھ بھی ہوا۔ حیرت اور دُکھ دونوں اس لئے ہوئے کہ کپور نے شاعری میں صوتی آہنگ کی اہمیت سے ایک طرح انکار کیا تھا۔ میں صوتی آہنگ کی شاعری میں بڑی اہمیت سمجھتا تھا۔

خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ اُس کے بعد پھر کبھی ساحر کی شاعری کا ذکر کپور کے ساتھ نہیں ہوا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اگرچہ اُس زمانے میں اُردو شاعری نے جو نیا رنگ رُوپ اختیار کیا تھا اُس کا ذکر کپور کے ساتھ اکثر رہتا تھا۔ کپور صرف میرے دوست ہی نہیں تھے بلکہ علمی و ادبی طور پر میرے رہنما بھی تھے۔ اس لئے کہ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگریزی اَدب پر اُن کی گہری نظر تھی اور انگریزی میں اُن کے اُستاد تھے احمد شاہ بخاری یعنی پطرس بخاری۔ اِس لئے اُن کی انگریزی ہر اعتبار سے مسلّمہ اور ادبی حیثیت کی تھی۔ مجھے اپنے انگریزی مقالے کپور کو دکھانے کا اور اُن مقالوں پر اُن سے اِصلاح لینے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

ہاں تو ساحرؔ کی مذکورہ نظم شہرت کے پر لگا کر اُڑی اور لاہور کے ادبی طبقے ساحرؔ کے نام سے گونج اُٹھے۔ ایک شاعرہ کے تعلق سے اُس کا ذکر لاہور کی محفلوں کی جان بن گیا۔ یہ ذکر چونکہ گوپال متّل اور دیوندر ستیارتھی کی تحریروں میں اکثر آچکا ہے اور خود اُس شاعرہ نے بھی اس کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے اِس لئے اُس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔

لیکن لاہور کے دو معروف ادبی حلقوں' حلقہ ءاَربابِ ذوق اور حلقہ ءاَربابِ علم میں ساحرؔ لدھیانوی کبھی نظر نہیں آتے تھے۔ یہ وہی حلقے ہیں جن کے متعلق ایک بار مولانا عبدالمجید سالکؔ نے کہا تھا کہ لاہور میں دو ادبی حلقے ہیں۔ ایک حلقہ ءاَربابِ ذوق جس میں علم کی کمی ہے اور دُوسرا حلقہ ءاَربابِ علم جس میں ذوق کی کمی ہے۔ ہوسکتا ہے اِس کا سبب یہ ہو کہ چوں کہ یہ دونوں حلقے ''ترقی پسند'' نہیں تھے اِس لئے ساحرؔ اِن حلقوں سے دُور ہی رہتے تھے۔ لیکن اُس وقت تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ ماہانہ یا دوماہی اجلاس لاہور میں شروع نہیں ہوئے تھے۔ تو ساحرؔ اُن حلقوں سے بے نیاز اپنی خلوت ہی میں عروسِ سخن کی زُلف سنوارنے میں مصروف تھے۔ چودھری نذیر احمد اور چودھری برکت علی نے ''ادبِ لطیف'' کی ادارت بھی اُن کے سپرد کر دی تھی لیکن جب کبھی اُن کا تعارف ''ادبِ لطیف'' کے مدیر کی حیثیت سے ہوتا تھا تو اُنھیں یہ بات بُری لگتی تھی۔ میرے سامنے کا ذکر ہے۔ ایس. پی. ایس

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کے ہال میں ایک مشاعرہ تھا۔ جب ساحرؔ کی باری آئی اور اناؤنسر نے اُن کا نام پیش کرتے ہوئے کہا کہ "تاج محل" اُن کی معروف نظم ہے وغیرہ وغیرہ اور "ادبِ لطیف" کے آپ ایڈیٹر ہیں تو ساحرؔ نے مائکروفون تک پہنچتے پہنچتے کہا کہ "ادبِ لطیف" کی ایڈیٹری کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن "ادبِ لطیف" کی ایڈیٹری سے ساحرؔ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے اُنھیں دُوسروں کے مضامین نظم ونثر دیکھنے کا جو موقع ملا ہوگا اُس سے اُن کی تخلیقی صلاحیتیں اور اُجاگر ہوئی ہوں گی۔ بہر طور مجھے اُن کے "ادبِ لطیف" کے زمانے کے زیادہ حالات معلوم نہیں سوائے ایک واقعے کے جو میرے سامنے رُونما ہوا۔

قریب قریب رات ہو چکی تھی۔ میں "ادبِ لطیف" کے دفتر میں ساحرؔ کے پاس بیٹھا تھا کہ عبدالمجید عدمؔ تشریف لائے۔ ساحرؔ اور میں بڑے احترام کے ساتھ اُن سے ملے۔ عدمؔ نے بیٹھتے ہی ساحرؔ سے خطاب کرتے ہوئے کہا حضور میری نظم آپ نے "ادبِ لطیف" میں شائع کی ہے لیکن اس کا معاوضہ مُجھے ابھی تک نہیں ملا۔[1] یہ سُن کر ساحرؔ سوچ میں پڑ گئے۔ اور بولے "نظم کے معاوضے کے متعلق تو چودھری نذیر احمد یا چودھری برکت علی نے مُجھ سے کچھ نہیں کہا۔ ویسے ہم "ادبِ لطیف" میں چھپنے والی تخلیقات پر معاوضہ تو نہیں دیتے۔"

عدمؔ: "لیکن حضور کچھ نہ کچھ تو آپ دیتے ہیں۔" (حضور کا لفظ عدمؔ صاحب کا تکیہ کلام تھا)۔

اب اِس "کچھ نہ کچھ" سے ساحرؔ کی حیرت میں اور اِضافہ ہوا اور بولے "عدمؔ صاحب میں سمجھا نہیں۔"

اس پر عدمؔ صاحب نے کچھ جھینپتے ہوئے میری طرف دیکھا اور ساحرؔ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "لیکن اس وقت ہمیں کچھ نہ کچھ تو چاہیے۔ پوری بوتل نہ سہی آدھی ہی سہی۔"

---

[1] عدمؔ ملٹری اکاؤنٹس راولپنڈی کے دفتر میں ایک بڑے افسر تھے لیکن شراب یعنی اُم الخبائث نے اُنھیں اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ (ح ن ا)

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اب ساحر کی سمجھ میں بات آئی کہ عدمؔ صاحب نظم کا معاوضہ کیوں طلب کر رہے ہیں۔ اب رات کے وقت چودھری نذیر احمد یا چودھری برکت علی کہاں سے آتے۔ ساحر کی جیب میں جو پانچ سات روپے تھے وہ اُنھوں نے عدمؔ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے اور عدمؔ صاحب شکریہ ادا کرتے ہوئے تشریف لے گئے۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تقسیم سے پہلے ساحرؔ کے ساتھ بس اسی طرح کی مُلاقاتیں رہیں۔ مُلک تقسیم ہوا تو میں دہلی آ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ لاہور سے نکلنے کے بعد ساحرؔ کا بھی پہلا پڑاؤ دہلی ہی تھا۔ بمبئی کہیں بعد میں جا کے اُن کا مستقر بنا۔ دہلی آنے کے بعد بے کاری اور آوارہ گردی کے علاوہ میرا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ میں عرشؔ ملسیانی کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُن کا مکان ریس پلیس میں تھا اور کناٹ پلیس یہاں سے بہت قریب تھی۔ چنانچہ میرا زیادہ تر وقت کناٹ پلیس ہی میں آوارہ گردی میں بسر ہوتا تھا۔ ابھی دہلی آئے دُوسرا یا تیسرا ہی دن ہوا ہوگا کہ کناٹ پلیس کی اسی آوارہ گردی کے دوران میں ساحرؔ اور دیوندر ستیارتھی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ایک دُوسرے کا حال ہم کیا پوچھتے۔ 'صورت نقش حالت مُپرس' والا معاملہ تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور ہم دونوں نے اپنا اپنا رستہ لیا۔ دُوسرے تیسرے دن پھر ملاقات ہوئی۔ اور اُس کے بعد تو ایسا اتفاق ہوا کہ اسی آوارہ گردی میں ہر تیسرے چوتھے روز ملاقات ہونے لگی۔ اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ یا تو میں اپنا راستہ چھوڑ کے ساحرؔ اور دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ہو لیتا یا وہ میرے ساتھ ہو لیتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ہم قریب ہی کسی چائے والے کی دوکان پر بیٹھ گئے اور چائے کی پیالی ہی پر دُنیا بھر کے مسائل پر گفتگو شروع ہو گئی۔ ادب سے لے کر سیاست تک۔ یہ ہمارے ایک دُوسرے کے قریب آنے کی ابتدا تھی۔

اسی طرح چند ماہ گذر گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ ساحرؔ کو بھی رہنے کے لئے پٹیل نگر میں مکان ملا اور ہم لوگوں کو بھی پٹیل نگر ہی میں۔ ہمیں وہ مکان ملا تھا جو ہم سے پہلے جوشؔ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ملیح آبادی کے پاس تھا۔ دراصل جوشؔ صاحب نے میرے والدِ محترم سے وعدہ کیا تھا کہ جب اُنھیں سرکاری کوٹھی الاٹ ہو جائے گی تو وہ یہ بنگش والا مکان ہمیں دے دیں گے۔ جوشؔ صاحب کو جب سرکاری کوٹھی الاٹ ہوئی تو اُنھوں نے اپنا وعدہ وفا کیا اور ہم اُن کے مکان میں چلے گئے۔ ساحرؔ کا مکان ایک ڈیڑھ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ پرکاش پنڈت بھی اُن کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ بلکہ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو یہ مکان پرکاش پنڈت کو ہی الاٹ ہوا تھا۔ اور ساحرؔ اُس میں پرکاش پنڈت کے دوست کی حیثیت سے فروکش تھے۔ اُن کی والدہ بھی اُن کے ساتھ ہی مقیم تھیں۔

اُنہی دنوں میں عبادتؔ بریلوی اور پریم ناتھ درؔ نے مل کر دہلی میں حلقہء اربابِ ذوق کی بنیاد ڈالی۔ جس کے جلسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ دِلّی کالج میں ہوا کرتے تھے۔ اس میں ہم دہلی کے اکثر شعرا اور اہلِ قلم ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ اس انجمن کے قیام سے ایک تو ہم لوگوں کے آپس میں باقاعدگی کے ساتھ ملنے کی اور ادبی موضوعات پر بحث کرنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ دُوسرا اس انجمن کا نام "حلقہء اربابِ ذوق" رکھنے سے ہم لوگوں کو کچھ یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ اِس طرح سے حلقہء اربابِ ذوق لاہور کے ساتھ ہمارا جذباتی تعلق قائم رہے گا۔ ساحرؔ بھی اس حلقے کے اجلاسوں میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک عمدہ بات یہ ہوئی کہ یوسف جامعی نے "شاہراہ" جاری کیا اور ساحرؔ کے ساتھ ملاقاتوں کے بیک وقت چار ٹھکانے سامنے آ گئے تھے۔ ساحرؔ کا گھر، ہمارا گھر، حلقہء اربابِ ذوق اور "شاہراہ" کا دفتر۔ اس دوستی کو اشتراکی نقطۂ نگاہ پر ہم خیالی نے اور زیادہ مضبوط کیا۔

اُنہی دنوں میں ایک دن ساحرؔ نے مجھے بتایا کہ وہ دہلی چھوڑ کر بمبئی جا رہے ہیں۔ پہلے مجھے اِس اطلاع سے ایک شاک سا ہوا لیکن جب ساحرؔ نے بتایا کہ فلم ڈائریکٹر ایس۔ کے۔ برمن (یا ایسا ہی کوئی نام تھا) اُنھیں ساڑھے سات سو ماہانہ پر بمبئی بلا رہے ہیں تو مجھے خوشی ہوئی۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اُس وقت ساحرؔ نے باتوں باتوں میں حق دوستی بھی ادا کیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم بھی چلنا چاہو تو میں اتنی ہی تنخواہ تمھیں بھی دلوا دوں گا۔ ایک لمحے کے لئے تو یہ پیش کش مجھے بہت اچھی لگی لیکن دوسرے لمحے خیال آیا کہ میں پبلی کیشنز ڈویژن میں ساڑھے چھ سو ماہانہ پا رہا ہوں۔ اس کے مقابلے میں بمبئی کے ساڑھے سات سو تو کم رہیں گے۔ کیوں کہ بمبئی دہلی کے مقابلے میں بہت ہی گراں شہر ہے۔ چنانچہ میں نے ساحرؔ سے کہا کہ میں تمھیں سوچ کے بتاؤں گا۔

میں نے اس دوران میں عرشؔ ملسیانی سے مشورہ کیا اور کرشن چندر کو خط لکھا۔ عرشؔ نے اس خیال کو پسند نہیں کیا۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ دہلی کے ساڑھے چھ سو کے مقابلے بمبئی کے ساڑھے سات سو کم ہیں اور ساتھ ہی اس اندیشے کا اظہار بھی کیا کہ فلم ڈائریکٹر چاہے تو دوسرے دن نکال دے۔ کرشن چندر کو بمبئی خط لکھ کر میں نے مشورہ مانگا تھا۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ یہ غلطی کبھی نہ کرنا۔ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ یہاں کی تنخواہ کا کوئی بھروسہ نہیں اور پھر نہ جانے نوکری کے واقعی ملنے تک کتنی مدت جوتیاں چٹخانا پڑیں۔ ساتھ ہی ایک اور عجیب و غریب بات لکھی کہ جب تمہارے ہاتھ میں ملازمت نہیں ہوگی تو تم میرے یہاں قیام کے ارادے سے آؤ گے۔ اور میرے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کو یہاں ٹھہرا سکوں۔ اس وقت بھی ایک شاعر میرے گھر کے برآمدے میں مقیم ہیں۔[1]

تو ساحرؔ دہلی میں ایک مختصر سے قیام کے بعد بمبئی چلے گئے۔ میں "آجکل" کے دفتر میں ہی قلم گھسیٹتا رہا۔

میں نے اُس وقت تک بمبئی نہیں دیکھی تھی۔ کوئی صورت ہی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ مشاعروں کے لئے دو ایک بار دعوت نامے ملے تھے لیکن میں جا نہ سکا تھا۔ پہلی بار بمبئی کو دیکھنے کا موقع مجھے اُس وقت ملا جب اعجاز صدیقی نے ماہنامہ "شاعر" کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں ایک

---

[1] کرشن نے کہا تھا "برآمدے میں پڑا ہے۔"

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

انڈو پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا۔ ہندوستان سے تو ہم شعرا کافی تعداد میں شریک مشاعرہ ہوئے۔ پاکستان سے میرے دو عزیز دوست قتیل شفائی اور سراج الدین ظفر آئے تھے۔ ہم تمام شعرا کے قیام و طعام کے انتظام کے لئے اکثر لوگوں نے پیش کش کر کے "شاعر" پر اخراجات کا بوجھ کسی حد تک یا بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔ ساحر نے اس وقت اعجاز کو یہ پیش کش کی کہ آپ قتیل شفائی اور جگن ناتھ آزاد کو میرے یہاں ٹھہرا دیجئے۔ چنانچہ میں اور قتیل اس مشاعرے کے بعد بھی جب تک بمبئی میں رہے ساحر ہی کے یہاں مقیم رہے۔

اس قیام کے دوران میں ساحر کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُس وقت ساحر ایک فلم کے چالیس ہزار روپے لیتے تھے۔ بعد میں سنا ہے یہ رقم کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ ایک دن بات چیت کے دوران میں ساحر نے مجھے یاد دلایا کہ اُس نے مجھے بمبئی کی فلمی دُنیا میں آنے کی پیش کش کی تھی۔ کہنے لگے "کبھی خیال تو آتا ہوگا کہ اُس وقت آ جاتا تو اچھا ہوتا۔" میں نے کہا ساحر میری موجودہ زندگی اتنی مصروف ہے کہ مجھے کبھی اس طرح کی باتوں پر سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اور فلم کا معاملہ یہ ہے کہ جب مجھے فلم دیکھنے کے لئے ہی وقت نہیں ملتا تو میں فلم کے لئے گانے یا مکالمے کیسے لکھ پاؤں گا۔ ساحر نے پوچھا اس وقت کیا تنخواہ پا رہے ہو۔ میں نے تنخواہ بتائی تو کہنے لگے کہ چلو یہ اطمینان تو ہے کہ ہر ماہ مل جاتی ہے۔ میں نے کہا میں نہیں سمجھا۔ بولے ہماری فلمی دُنیا میں یہ یقین نہیں ہوتا کہ جو آمدنی ہماری آج ہے وہ کل رہے گی یا نہیں۔ معلوم نہیں یہ صورت حال کہاں تک حقیقت پر مبنی تھی لیکن میں یہ سُن کر سناٹے میں آ گیا۔

اُس وقت پرکاش پنڈت بھی ساحر ہی کے یہاں مقیم تھے اور مشاعرے کے بعد یہ پانچ سات دن بہت مزے سے بسر ہوئے۔ قتیل تو میرے آنے کے بعد بھی کچھ مدت بمبئی میں رہے اور غالباً ساحر کے یہاں ہی رہے۔

اس کے بعد ساحر کے یہاں ٹھہرنے کا ایک بار پھر اتفاق ہوا۔ تین چار روز کے لئے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اُس وقت پرکاش پنڈت وہاں نہیں تھے۔ ساحرؔ کی شاہ خرچی کا عالم میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اب کے بھی وہی عالم تھا۔ ساحرؔ ہر روز ایک بوتل اسکاچ کی منگواتے۔ اُس وقت غالباً اسکاچ ۱۰۰ روپے میں آتی تھی۔ اُس زمانے میں سو روپیہ بڑی رقم سمجھی جاتی تھی اور میرے اندازے سے سو روپیہ ہر روز شراب پر خرچ کرنا روپیہ ضائع کرنے کی مد میں آتا تھا۔ ساحرؔ بہت زیادہ پینے والے نہیں تھے۔ ہم دونوں مل کے چار پانچ پیگ ہی لیتے ہوں گے لیکن روز نئی بوتل آتی تھی۔ میں نے ساحرؔ سے ایک روز کہا کہ تم ہر روز ایک بوتل منگواتے ہو ہم دونوں تو نصف بوتل بھی ختم نہیں کر پاتے۔ یہ باقی شراب جاتی کہاں ہے۔ ساحرؔ نے اِس بات میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لی۔ کہنے لگے "معلوم نہیں۔" میں نے پوچھا۔ "کیا نوکر چاکر پی جاتے ہیں؟" اُسی بے پروائی سے بولا۔ "ہوسکتا ہے۔" اور میرے لئے یہ بات بڑی حیرت انگیز تھی کہ گھر کے ملازم ہر روز اسکاچ میں بھی حصہ دار بنے ہوئے ہوں۔

میرے والدِ محترم کا مجموعہ کلام "کاروانِ وطن" اُسی زمانے میں چھپا تھا۔ میں اُس کی ایک جلد ساحرؔ کے لئے لے گیا تھا۔ شام کو جب دورِ جام چل رہا تھا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے یہ کتاب ابھی تک ساحرؔ کو نہیں دی۔ چنانچہ میں اُٹھا اور بکس سے کتاب نکال کر لے آیا اور جب ساحرؔ کو دی تو شراب کو چھوڑ کر وہ کھڑا ہوا' بڑے ادب سے کتاب میرے ہاتھ سے لی اور مجھے آداب کر کے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا یار یہ کیا مسخرا پن ہے۔ کہنے لگا یہ تمھاری کتاب نہیں ہے۔ محروم صاحب کا مجموعہ کلام ہے۔ اور اس سے زیادہ احترام کا حقدار ہے۔ ساحرؔ کے اِس طرزِ عمل سے مجھے کتنی مسرت ہوئی ہوگی اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی دورانِ قیام کا ذکر ہے۔ ساحرؔ کا چھوٹا سا ذخیرہ کتب میں دیکھ رہا تھا "تلخیاں" کھول کر نظم "تاج محل" جو دیکھی تو اس میں یہ مصرع

ع - 'مری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ کو'

کی جگہ یہ مصرع نظر آیا:

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ع - 'مری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے'

مجھے یاد آیا کہ "مجھ کو" پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کی جگہ "مجھ سے" ہونا چاہئے۔ میں نے کہا ساحر تم نے بلاوجہ ہی یہ مصرع تبدیل کیا ہے۔ "مجھ سے" بھی صحیح ہے۔ "مجھ کو" بھی صحیح ہے۔ بعض لوگوں نے جو اعتراض کیا ہے وہ غلط ہے۔ کہنا اور ملنا کا صلہ "سے" بھی ہے اور "کو" بھی۔ میں نے ساحر کو بتایا کہ یہی اعتراض علامہ اقبالؔ پر حسرت موہانی کے "اردوئے معلےٰ" میں بر جکیم برہم نے کیا تھا۔ جواب میں اقبالؔ نے کئی اساتذہ کے مصرعے پیش کئے تھے جن میں کہنا کا صلہ "کو" ہے "سے" نہیں۔ مثلاً ایک مصرع امیر مینائی کا جو اقبالؔ نے سند کے طور پر استعمال کیا تھا یہ ہے:

ع - آکے بیٹھے سر بالیں نہ کہے تُم مجھ کو

ساحر نے کہا حسرت موہانی کے رسالے کا اعتراض یا اقبالؔ کا جواب تو میں نے دیکھا نہیں تھا اور مجھے "اردوئے معلےٰ" کی اس بحث کا بھی علم نہیں۔ اگر تم پہلے بتاتے تو میں یہ بلا ضرورت تبدیلی نہ کرتا۔ میں نے کہا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس موضوع پر تمہارے ساتھ پہلے بھی بات ہوئی ہے۔ لیکن ساحر نے اس کی تردید کی کہ اگر یہ بات میرے ساتھ ہوئی ہوتی تو مجھے یاد رہتی۔ کیونکہ اس سے میرا مصرع اعتراض کی زد سے نکل جاتا۔ بہر طور اب نئے ایڈیشن میں دیکھیں گے۔ معلوم نہیں اس کے بعد "تلخیاں" کا کوئی نیا ایڈیشن چھپا یا نہیں۔ اور چھپا تو اس میں یہ مصرع اپنی اصل صورت میں موجود ہے یا نہیں۔

میں نے اس مقالے میں کہیں پہلے ذکر کیا ہے کہ ساحر سے قرب کا سبب اشتراکی خیالات پر ہم دونوں کی ہم آہنگی بھی تھی لیکن میں حکومتِ ہند کا ملازم ہونے کے باعث اپنے اشتراکی خیالات کا کھلم کھلا اظہار نہیں کیا کرتا تھا اور بہت محتاط رہتا تھا۔ مگر اس تمام احتیاط کے باوجود میں ایک بار حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا اور میرے تین چار برس انتہائی کرب کے عالم میں گذرے۔ لیکن یہ ایک بالکل ہی الگ داستان ہے۔ کہہ میں یہ رہا تھا کہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ساحرؔ سے میرے قُرب کا ایک سبب ہم دونوں کے سیاسی خیالات کی ہم آہنگی بھی تھی۔ اب مجھے سن تو یاد نہیں لیکن میں نے اُسی زمانے میں ایک نظم کہی تھی، جس کا عنوان تھا۔

''ایک دوست کے نام ــــــ

جو شاعر بھی ہے اور ہم خیال بھی''

یہ نظم میرے مجموعہ کلام ''ستاروں سے ذرّوں تک'' میں شامل ہے۔ پہلے ایڈیشن میں بھی اور دوسرے ایڈیشن میں بھی۔ ''ستاروں سے ذرّوں تک'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نظم ۱۹۵۱ء یا ۱۹۵۰ء سے پہلے ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس نظم میں براہِ راست عنوان ''ساحرؔ لدھیانوی کے نام'' نہ دینے کا سبب وہی تھا جو اُوپر بیان کر چکا ہوں، یعنی یہ احتیاط کہ اشتراکی خیالات والے شعراء کے ساتھ میرا قرب ظاہر نہ ہونے پائے۔ بہر طور ساحرؔ کو معلوم تھا کہ یہ نظم اُنھی کے نام ہے۔ یہ نظم اس انکشاف کے ساتھ کہ یہ کس کے نام ہے، میں پہلی بار اس مقالے میں منظرِ عام پر لا رہا ہوں:

اُٹھ کہ پیدا ہے تجلّی اُفقِ خاور پر
اس تجلّی کو زمانے میں سحر بار کریں

چھا گیا ابرِ مساوات فلک پر ہر سُو
خاک پر اس کو گہر ریز و گہر بار کریں

صبح کا نُور لئے دولتِ بیدار آیا
عام اب دہر میں یہ دولتِ بیدار کریں

عزم کے ہاتھ میں شمشیرِ شجاعت دیکر
جہدِ ہستی میں اسے مائلِ پیکار کریں

مائلِ خواب نہ ہو جاگ اُٹھے بزمِ جہاں
اپنے نغمات سے پیدا وہ جھنکار کریں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

روحِ انساں تو ہے بیدار بڑی مدت سے
ذہنِ انساں کو اب اس دور میں بیدار کریں

دامِ انوار کا پستی و بلندی پہ بچھائیں
اس میں دنیا کے اندھیروں کو گرفتار کریں

دہر پر عدل و مساوات کا پرچم لہرائیں
پرچمِ ظلم کو عالم میں نگوں سار کریں

سطحِ میخانۂ انساں میں ہے ناہمواری
وقت کا حکم ہے اس سطح کو ہموار کریں

آدم آدم کا نئے دور میں غم خوار نہیں
آ کہ انسان کو انسان کا غم خوار کریں

کس لئے تیغِ شقاوت کی رواں ہو ہر سُو
آ کہ اس تیغ کو اب کند و کم آزار کریں

اپنی بیداری سے اب کام نہیں چل سکتا
خود تو بیدار ہیں اوروں کو بھی بیدار کریں

دہر کو مل نہ سکا "اندک و بسیار" کا حل
آ کہ حل مسئلۂ اندک و بسیار کریں

روئے عالم پہ جو پامال نظر آتا ہے
روئے عالم کا اُسے مالک و مختار کریں

جس پہ ہر نعمتِ عالم کے ہیں دروازے بند
اس کو ہر نعمتِ عالم کا سزاوار کریں

مژدہ اے دوست کہ چشمِ انوار آیا
آ کہ نظارہ چشمِ انوار کریں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

جو گرفتارِ غمِ فتنہ جاناں ہیں انھیں
واقفِ غلغلۂ گرمیِ بازار کریں

زُلف و رُخسار کے بیمار خریداروں کو
رسن و دار کی چیزوں کا خریدار کریں

حکمِ پابندیِ صیاد کا جاری کر کے
جشنِ آزادیِ مُرغانِ گرفتار کریں

دو ظاہر میں جو ہوں باطن میں عدو
زندگی اُن کی چمن زار میں دشوار کریں

اپنا پیغام زمانے کو سنانے کی عوض
تاج اور تخت بھی ملتے ہوں تو انکار کریں[1]

ساحرؔ کے یہاں اس قیام کے دوران میں بھی اور پہلے قیام کے دوران میں بھی میں نے دیکھا کہ ساحرؔ کی والدہ اور بہن انور کی موجودگی سے گھر صحیح معنی میں گھر نظر آ رہا ہے۔ ورنہ ساحرؔ کے عادات و اطوار اور اُٹھنا بیٹھنا تو ایسا تھا کہ گھر ایک طرح کا بورڈنگ ہاؤس بن جاتا۔ ساحرؔ کا دن کے دس بجے جاگنا، گیارہ یا دو بجے ناشتہ کرنا، نہ دن کے کھانے کا وقت مقرر نہ رات کے کھانے کا، جیسے انسان سیر و تفریح کے دنوں میں کسی ہوٹل میں قیام کرتا ہے ایسا ہی نقشہ بن جاتا۔ لیکن ماں جی اور انور کی بدولت گھر میں کوئی بدانتظامی رُونما نہیں ہونے پائی۔ ساحرؔ کو بھی اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ ایسی محبت تھی کہ زیادہ تر گھروں میں شاید نظر نہ آتی ہو۔

---

[1] یہ نظم آج سے اکتیس بتیس برس پہلے کی ہے اور اسے اسی خیال سے دیکھنا چاہئے۔ (آزاد)
اوپر کا غلغلہ لکھے ہوئے بھی ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ اب کیا کہا جائے یہ نظم میں نے کب کہی تھی۔ "ستاروں سے ذروں تک" کا پہلا ایڈیشن دیکھ کر کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اس کے بعد ایک مدت تک ساحرؔ کے ساتھ ڈھنگ کی ملاقات نہ ہو سکی۔ یوں تو حیدرآباد کے مشاعرے میں بھی ملاقات ہوئی، بمبئی کے دو مشاعروں میں، بمبئی دہلی کے چار مشاعروں میں بھی اور گیا کے مشاعرے میں بھی۔ لیکن آپس میں بیٹھ کے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں بھی اس دوران میں دہلی سے سری نگر پہنچ گیا تھا۔ وہاں ایک غلط خبر نہ جانے کس ذریعہ سے مجھے ملی کہ ساحرؔ کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن خبر مصدقہ نہیں تھی۔ اس لئے تعزیت کا خط میں نے نہ لکھا۔ کچھ مدت بعد لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کا قیام گلرگ ہوٹل میں تھا۔ میں ہوٹل میں پہنچنے کے بعد ابھی ساحرؔ سے ملا نہیں تھا۔ حیران تھا کہ اس خبر کے بارے میں کس طرح پوچھوں۔ کیا پتہ غلط ہی ہو۔ آخر جب آمنا سامنا ہوا تو ساحرؔ ہشاش بشاش نظر آئے۔ یہ دیکھ کر پہلا خیال میرے دل میں یہی آیا کہ خبر غلط تھی لیکن چوں کہ ساحرؔ کی والدہ مجھے بہت عزیز رکھتی تھیں اس لئے اُن کی خیریت پوچھنا ضروری تھا۔

چنانچہ میں نے سوال کیا کہ۔

''ماں جی کی صحت ٹھیک ہے؟''[1]

ساحرؔ ہنس پڑا اور الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''زندہ ہیں۔''

اور ساتھ ہی پوچھا کیا تم تک بھی انتقال کی خبر پہنچ گئی؟ میں نے نہ جانے گھبراہٹ میں ہاں کہا یا نا۔ تو ساحرؔ نے کہا جھینپنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ غلط خبر غالباً لدھیانے سے چلی تھی۔ مجھ تک بھی پہنچ گئی تھی لیکن بمبئی میں پھیلی نہیں تھی۔

اُس رات مشاعرے سے قبل ساحرؔ کے کمرے میں حسب دستور محفل جمی تھی۔ مدعو دوستوں کے علاوہ غیر مدعو دوست بھی آموجود ہوئے۔ ساحرؔ کی دریا دلی نے شراب کے دریا

---

[1] ساحرؔ ہمیشہ اپنی والدہ کو ماں جی کہتے تھے۔ چنانچہ میں بھی انھیں ہمیشہ ماں جی ہی کہتا رہا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بہادیے۔ اس کے بعد کھانا آیا اور کھانے کے بعد ساحرؔ نے انتہائی رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا کہ تمھیں اس مشاعرے کا معاوضہ مل گیا؟ مجھے حیرت ہوئی کہ ساحرؔ ایسی بات کیوں پوچھ رہا ہے۔ لیکن جو حقیقتِ حال تھی میں نے بتادی کہ ابھی تک نہیں ملا۔ لیکن مشاعرے کے بعد مل جائے گا۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ ایسی بات تم نے آج تک نہیں پوچھی۔ کہنے لگا۔ یار منتظمین نے مجھ سے معاوضے کی بات تک نہیں کی۔ میں نے کہا۔ تو کیا ہوا؟ اگر اُنھوں نے تمھیں معاوضہ نہ بھی دیا تو تمھیں کیا فرق پڑتا ہے۔ اور غالباً دے ہی دیں گے۔ اور تمھیں دو دیں بھی تو پانچ سات ہزار سے کم کیا دیں[1] اور یہ بھی صحیح ہے کہ تمھیں پانچ سات ہزار کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور منتظمین مشاعرہ کے لئے یہ بہت بڑی رقم ہے۔ کہنے لگا۔ بات تو ٹھیک ہے، لیکن معاوضہ لئے بغیر مشاعرے میں شریک ہونے سے شاعر بے وقوف نظر آتا ہے۔ میں نے کہا لیکن بعض شاعر ایسے ہوتے ہیں جو معاوضہ لینے کے بعد بھی بے وقوف نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے کہا کوئی بات نہیں اگر تمھیں معاوضہ نہ ملا تو میں مشاعرے میں اعلان کردوں گا کہ ساحرؔ نے مشاعرہ کمیٹی کو سات ہزار روپے چندہ دیا ہے۔ بہرطور یہ سب نشے کی باتیں تھیں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد میں نے ساحرؔ سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ معاوضہ مل گیا ہے۔ میں نے یہ نہ پوچھا کہ کتنا ملا ہے۔ کیوں کہ اس سوال کے کوئی معنی نہیں۔ ساحرؔ ملک کے مقبول ترین شاعروں میں سے تھا۔ اُسے جتنا بھی معاوضہ ملتا کم تھا۔ اُس مشاعرے میں بھی ڈولھا ساحرؔ ہی تھا۔

ساحرؔ سے میری آخری ملاقات ۱۹۸۰ء کے شروع میں ہوئی۔ بمبئی میں اپنی بیوی کے علاج کے لئے میں وہاں گیا تھا۔ مہاراشٹر اُردو اکیڈمی کا سالانہ جلسہ تھا یا کوئی خاص جلسہ تھا۔ خواجہ عبدالغفور آئی۔ اے۔ ایس، سکریٹری اکیڈمی نے مجھے بھی مدعو کیا۔ اس جلسے میں اکثر دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ ساحرؔ سے بھی۔ ساحرؔ اُسی تپاک سے ملے۔ میں نے کہا میں نے

---

[1] اُس زمانے میں پانچ سات ہزار معاوضہ بڑا معاوضہ سمجھا جاتا تھا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

دو بار ٹیلیفون کیا۔ تم ملے نہیں۔ اب ملاقات ہونی چاہئے اور تمہارا جوہو والا نیا مکان بلکہ مکانات بھی نہیں دیکھے۔ ہاؤس وارمنگ تو ہو چکی ہوگی لیکن ایک بار اس کی تجدید ہو جانا چاہئے۔ ساحر نے کہا کہ میں تمھیں فون کروں گا۔ میں نے اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیا۔ اس کے بعد میں کوئی دس دن بمبئی میں رہا۔ ساحر کا ٹیلی فون نہ آیا۔ میں بمبئی سے واپس آ گیا۔ دل میں یہ ملال تھا کہ ساحر نے ٹیلی فون نہیں کیا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا دو ایک بار ذکر کیا۔ اُس نے کہا کوئی مصروفیت ہو گئی ہوگی۔ آپ ہی دوبارہ فون کر لیتے۔ لیکن میں تو پہلے دو بار فون کر چکا تھا۔ اب بار بار کیوں کرتا۔ چنانچہ اس بات سے میرے آئینۂ دل میں بال آ گیا۔ مجھے ساحر کی یہ بات پسند نہ آئی اور میں نے سوچا کہ اب بمبئی جاؤں گا اور اگر کہیں ساحر سے ملاقات ہو گئی تو میں بے رُخی سے پیش آؤں گا۔ چاہے وہ بے رُخی دکھاوے کی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بمبئی جانے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اور ساحر بمبئی کو چھوڑ کر اس سفر پر چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

اب میں یہ تو نہیں کہتا کہ ساحر کے جانے کے بعد بمبئی سُونی ہو گئی ہے۔ میرے کئی جان سے پیارے دوست اب بھی بمبئی میں آباد ہیں۔ خدا انھیں تادیر زندہ سلامت رکھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ:

صد موج رازِ رفتنِ خود مضطرب کند
موجے کہ بر کنار رَوَد از میان ما

ساحر چلے گئے۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ اور جاں نثار اختر اُس سے پہلے جا چکے تھے۔ اور مجھے اس وقت حفیظ جالندھری کا یہ شعر یاد آ رہا ہے ؎

مری بزمِ وفا سے جانے والو!
ذرا ٹھہرو کہ میں بھی آ رہا ہوں

□□□

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

حبیب خان کی یاد میں

(تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی)

سال یا مہینہ تو یاد نہیں آ رہا ہے لیکن اتنا یاد ہے کہ حبیب خان صاحب سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ میں ہوئی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تقسیم ہند کے فوراً بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) کا دفتر مولانا آزاد کے فیصلے کے مطابق دہلی سے علی گڑھ منتقل ہوا تھا۔ اِس نئے انتظام کے تحت اُس وقت علی گڑھ میں انجمن کے پہلے سیکریٹری قاضی عبدالغفار تھے۔ اُن کے بعد پروفیسر آلِ احمد سرور انجمن کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ انھی کی سیکریٹری شپ کے زمانے میں حبیب خان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ انجمن کے دفتر میں۔

انھی دنوں میں قاضی عبدالغفار مرحوم نے میری طویل نظم ''اُردو'' کے بارے میں ایک نہایت خوبصورت تحریر سپردِ قلم کی تھی اور مذکورہ طویل نظم ایک پمفلٹ کی صورت میں اس تحریر کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ یہ طویل نظم اس وقت بھی میرے مجموعہ کلام ''بیکراں'' کے آخر میں شامل ہے یہ وہاں اُس وقت انجمن کے دفتر میں موجود تھی۔ غالباً حبیب خان اسے دیکھ چکے تھے۔ رسمی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تعارف کے بعد اسی کتابچے سے (یا طویل نظم کے حوالے سے) اُنھوں نے بات شروع کی۔ اُنھوں نے اس نظم کے بارے میں چند سوالات کیے اور میں نے اُنھیں تفصیل سے نظم کے پس منظر سے متعلق بتایا۔ اُنھوں نے میری بات دلچسپی سے سُنی اور اکثر نکات وہ نوٹ کرتے چلے گئے۔

اُسی شام کو وہ سرور صاحب کے دولت کدے پر بھی تشریف لائے۔ میں بھی اُس وقت وہیں تھا کیونکہ میرا تو قیام ہی سرور صاحب کے وہاں تھا اور جب تک سرور صاحب علی گڑھ میں رہے میرا قیام اُنھی کے یہاں ہوتا رہا۔ اُس وقت حبیب صاحب کی میرے ساتھ بات چیت نہ ہوئی کیونکہ وہ انجمن کے بعض مسائل لے کر سرور صاحب کے ساتھ بات چیت کرنے آئے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد سرور صاحب نے اُن کا ذکر خاصے تعریفی الفاظ میں کیا۔

اس کے بعد طویل عرصے تک حبیب خان سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ لیکن جب میں انجمن کی مجلس عام کا رُکن منتخب ہو گیا تو اُردو گھر میں آنے جانے کے زیادہ مواقع ملنے لگے۔ اور حبیب خان سے بھی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے اُنھیں ہمیشہ اپنے کام میں مصروف دیکھا۔ اور یہ صورتِ حال آخر تک قائم رہی۔

جب میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کا صدر منتخب ہو گیا تو اسٹاف کے مختلف اراکین کے بارے میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سیکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ کبھی کبھار بات چیت ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ حبیب خان کے بارے میں خلیق انجم صاحب اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میرا تجربہ زندگی بھر کا مجھے یہ بتاتا ہے کہ اگر کسی دفتر یا ادارے کے ایگزیکٹو ہیڈ کی رائے اپنے اسٹاف کی اکثریت سے متعلق اچھی رائے ہے تو میں اسے ایگزیکٹو ہیڈ کی انتظامی صلاحیت پر بھی محمول کرتا ہوں اور اسے دفتر یا تنظیم یا ادارے کے بارے میں نیک فال بھی سمجھتا ہوں۔

گذشتہ متعدد برسوں میں اُردو گھر نے خاصی ترقی کی ہے اور ملک بھر میں بلکہ ملک

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کے باہر بھی اِس ادارے نے یعنی انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اُردو کا مقام بلند سے بلند تر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے تو اِس کا کریڈٹ ایگزیکٹو ہیڈ کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے رفقائے کار کو بھی جاتا ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جنرل سیکریٹری کے رفقائے کار میں حبیب خان ایک قابلِ تعریف رفیقِ کار رہے ہیں۔ جنرل سیکریٹری صاحب کی زبانی میں نے اُن کی تعریف اکثر سُنی ہے۔

یہ حبیب خان صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو تھا۔ دُوسرا اہم پہلو اُن کے اہلِ قلم ہونے کا تھا۔ دفتر یا ادارے میں ایک مصروف زندگی بسر کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اگر ایک اہلِ قلم تصنیف و تالیف کے کام کو جاری رکھتا ہے تو یہ ایک قابلِ تعریف بات ہے اور حبیب خان ہر اعتبار سے اس تعریف کے مستحق ہیں۔

حبیب خان نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور مُرتب کی ہیں۔ میں صرف ایک کتاب کا ذکر کروں گا۔ اس کتاب کا نام ہے "دیوانِ عرش"، اور یہ اُن کی تصنیف نہیں ہے بلکہ تالیف ہے۔ ظاہر ہے یہ مجموعہ کلام تو عرش کی تصنیف ہے اور اس کا ایک ایڈیشن حبیب خان کے ایڈیشن سے پہلے مطبع کارنامہ لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے لیکن جب ہم حبیب خان کے ایڈیشن میں حبیب خان کا لکھا ہوا "مقدمہ" دیکھتے ہیں تو ایک اہلِ قلم کے طور پر اُن کی شخصیت کے کئی ابعاد ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے میں اُن کی جس خصوصیت کا ذکر کروں گا وہ اُن کی خوبصورت نثر ہے۔ رواں دواں نثر۔ تنقید اور تحقیق پر مبنی نثر کو دلکش بنانا خاصا مشکل ہے ۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دیکھئے اِن چند جملوں میں حبیب خان نے اکثر اہم شعراء اور اُن کی مالی حالت پر کس قدر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور کس قدر دلاویز اور بے تکلف اندازِ بیان ہے:

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

"نواب آصف الدولہ اہلِ کمال کے بڑے قدر دان تھے۔ انھیں جب میرؔ کی پریشانی کا علم ہوا تو انھوں نے میرؔ کو لکھنؤ بلوالیا اور وہ تین سو روپے ماہوار پر اُن کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ لکھنؤ میں میر کی بڑی قدر و منزلت ہوئی تاہم اتنی بڑی رقم ملنے کے باوجود وہ خوش نہیں رہے حالانکہ غالب کے لئے اتنی بڑی رقم کہیں سے مقرر نہیں ہوئی۔ ذوق کو شروع میں چار روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ بعد میں پانچ پھر سات روپے ہو گیا اور اضافہ ہوتے ہوتے آخر میں چار سو روپے ماہوار ملنے لگے۔"

میر کلو عرشؔ کے بارے میں ہم اُردو والوں میں اکثر لوگ اتنا تو جانتے تھے کہ میر تقی میرؔ کے ایک بیٹے کا نام میر حسن عسکری تھا اور عرف میر کلو، لیکن اُن میں سے بھی بعض کو معلوم نہیں تھا کہ وہ شاعر تھے اور عرشؔ تخلص کرتے تھے۔ حبیب خان صاحب نے میر عرشؔ کے دیوان کو دوبارہ زندہ کر کے اُردو والوں کے علم میں اضافہ کیا ہے۔

میں نے چند سطور اُوپر حبیب خان کی نثر نگاری کا ذکر کیا ہے۔ ایک ناظرِ انتقاد کے نقطۂ نگاہ سے اُن کی نثر ملاحظہ کریں:

"میرؔ زبان و بیان، قواعد و علمیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے شاگردوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اُن کے ہمعصروں میں مرزا محمد رفیع سودا، مرزا مظہر جانِ جاناں، خواجہ میر درد، قیام الدین قائم اور انعام اللہ خان یقینؔ بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کا شمار اُساتذہ میں ہوتا ہے لیکن اُن میں صرف سودا کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُن کے شاگردوں کی تعداد سب

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سے زیادہ ہے۔"

نثر کی یہی دلکشی حبیب خاں صاحب کی تحقیق میں بھی نظر آتی ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آبِ بقا لکھتے وقت عشرت مرحوم کے سامنے قواعدِ میر کا نسخہ نہیں تھا۔ عرش اپنے شاگرد کو عزیز رکھتے تھے اور عشرت شاد کے شاگرد تھے اس لیے اپنے اُستاد کی محبت کی وجہ سے یہ قواعد، میر سے منسوب کر کے آبِ بقا میں لکھ دیا تا کہ کتاب کی افادیت اور شہرت میں اضافہ ہو جائے۔"

اِن تمام علمی اور ادبی خوبیوں کے ساتھ ہی ساتھ حبیب خان صاحب نے ایک معروف شریف اور نیک زندگی گزاری اور تا حیات شیخ سعدیؒ کی اس نصیحت پر عمل پیرا رہے ۔

نیکی کُن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

(۲۶ مارچ ۲۰۰۱ء)

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

صاؔبر دت

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو　　　ہمہ خنداں بُدند و تو گریاں

آں چناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو　　　ہمہ گریاں بُوند و تو خنداں

صاؔبر دت کے انتقال کی خبر سُنی تو دل و دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور شیخ سعدیؒ کا مندرجہ بالا قطعہ میری زبان پر آ گیا۔ صاؔبر کے علیل ہونے کی خبریں تو کچھ دنوں سے کان میں پڑ رہی تھیں مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ یارِ عزیز اس قدر جلد ہم سے جدا ہو جائے گا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ!

ابھی بہت دن نہیں گزرے، ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ صاؔبر دت نے "فن اور شخصیت" کے جو نمبر شائع کیے ہیں اُن میں اب ایک نئے نمبر کا اضافہ ہو رہا ہے اور وہ نمبر ہو گا "اِندر کمار گجرال نمبر"۔ اس نمبر کی رسمِ رونمائی اردو گھر میں فلاں تاریخ کو ہوگی، آپ اس تاریخ تک دہلی پہنچ جائیے، کیونکہ اس جلسے کی صدارت آپ ہی کر رہے ہیں۔ میرے چونکہ گجرال صاحب سے نیازمندانہ مراسم ایک زمانے سے چلے آ رہے ہیں اور صاؔبر دت سے تو بے تکلفی تھی ہی میں نے فوراً ہامی بھر لی لیکن ابھی وہ طے شدہ تاریخ نہیں آئی تھی کہ اخبارات میں پڑھا کہ صاؔبر دت کا بمبئی کے فلاں ہسپتال میں انتقال ہو گیا ہے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

صابر دت اُردو کے ایک سچے اور مخلص خدمت گزار تھے، اُردو کے خدمت گزاروں کی کتنی ہی مختصر فہرست کیوں نہ تیار کی جائے صابر دت کے نام کے بغیر وہ نامکمل رہے گی۔ کسی بھی زبان کے خدمت گزار کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جو لوگ تخلیقی فن کار ہوتے ہیں مثلاً شاعر یا افسانہ نگار۔ وہ بھی ایک طرح سے اُردو کے خدمت گزار ہی کہلاتے ہیں، نقاد اور محققین بھی، رسالہ یا اخبار نکالنے والے بھی، ناشرین بھی، لیکن اُس شخص کا مرتبہ اُن سب سے بڑا ہوتا ہے جو تخلیقی فن کار ہوتے ہوئے اخبار یا رسالہ بھی نکالے اور اپنی خدمات دُوسروں کو حیاتِ جاوداں بخشنے کے لیے وقف کر دے۔

صابر دت بھی ایک تخلیقی فنکار تھے۔ اُن کی پہلی پہچان شاعر کی تھی اور ہے۔ اُن کا پہلا مجموعہ، کلام "پل دو پل" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ دُوسرا شعری مجموعہ "موجِ عارض" ۱۹۹۳ء میں۔ ان مجموعوں نے اُن کی شاعری کو ایک مسلمہ حیثیت عطا کر دی۔ لیکن اُنھوں نے اپنی ساری توجہ شاعری پر مرکوز نہیں کی بلکہ دُوسرے اہلِ قلم کے کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے اپنا ایک ایک لمحہ وقف کر دیا۔ اپنے اس عزمِ راسخ کی بدولت اُنھوں نے شیخ سعدیؒ کے اس مقولے پر عمل کرتے ہوئے کہ "نام نیکِ رفتگاں ضائع مکُن" یکے بعد دیگرے "فن اور شخصیت" کے خاص نمبر نکالے۔ پہلا نمبر مہندر ناتھ نمبر تھا جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بالترتیب جاں نثار اختر نمبر، کملیشور نمبر، غزل نمبر، آپ بیتی نمبر، فیض احمد فیض نمبر، قتیل شفائی نمبر، نرگس دت نمبر، ساحر لدھیانوی نمبر، گنیش بہاری طرز نمبر، کوائف نمبر، کشمیری لال ذاکر نمبر، اور قطعہ نمبر منظرِ عام پر آئے جنھوں نے اُردو دُنیا کے گوشے گوشے میں ان تمام اہلِ قلم حضرات کے ناموں کی بھی دُھوم مچا دی اور خود صابر دت کے نام کا ڈنکا بھی چار دانگ عالم میں بجنے لگ گیا۔ ان خاص نمبروں کے علاوہ اُنھوں نے ایک البم بھی شائع کیا جو امیر خسرو سے لے کے آج تک کے اہم اہلِ قلم حضرات کی تصاویر پر مشتمل ہے۔

علی سردار جعفری نے ان نمبروں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

"صابر دت نے اُردو ادب میں اپنے لیے ایک

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

قابلِ رشک مقام بنا لیا ہے۔ اس عہد کی ادبی تاریخ صابر دت
کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اُنھوں نے اب تک "فن اور
شخصیت" کے نام سے جو نمبر شائع کیے ہیں ان میں سے دو ایک
نظر انداز کیے جانے کے قابل ہیں تا کہ اچھے نمبروں کو نظر نہ
لگے۔ باقی نمبروں کی ترتیب، تالیف میں ایک ادبی نگاہ اور ادبی
شان ہے۔ یہ نمبر صرف یادگار نہیں رہیں گے بلکہ آنے والے
زمانے میں مورخ ادب کی راہوں کو روشن کرنے میں مدد دیں
گے۔ صاحبانِ ذوق کے لیے تسکین کا سامان فراہم کریں گے اور
کم ذوق لوگوں کو ادب آشنا بنانے کا کام بھی کریں گے۔"

مذکورہ بالا نمبروں کے علاوہ صابر دت نے فن اور شخصیت کا ایک خاص نمبر بھی نکالا۔ اس کا نام ہے مقبول شعراء نمبر۔ یہ نمبر میر تقی میر نے سے لے کر پروین شاکر تک کے ناموں پر مشتمل ہے۔

میں نے سطورِ بالا میں ذکر کیا ہے کہ صابر دت کی پہلی پہچان شاعر کی ہے۔ اُن کی شاعری رُومانیت اور کلاسیکیت کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں آج یہ پرانی ترکیبیں بن کے رہ گئی ہیں، لیکن ان تراکیب کو استعمال کیے بغیر بات بنتی نہیں ہے۔ مجھے صابر دت کی شاعری میں ایک اور غم بھی نظر آتا ہے اور وہ ہے غمِ ذات۔ یہاں میں یہ بھی کہہ دوں کہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک دوسرے کا تضاد نہیں ہیں، عُرفی نے کیا خوب کہا ہے ۔

دردل ما غمِ دُنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ گند شیشہ ما

مجھے صابر دت کی شاعری عُرفی کے اسی شعر کی تفسیر نظر آتی ہے۔ صابر دت خارجی واردات کو

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اِس خوبصورتی سے داخلی واردات میں تبدیل کر کے تخلیقِ شعر کرتے ہیں کہ اُن کا شعر حُسنِ ظاہر اور حُسنِ باطن کا ایک مُرقّع نظر آتا ہے۔ اُن کی نظم ''اِنتظار'' دیکھیے یا ''اعتراف''، ''تعلیم'' دیکھیے یا ''روشنی'' ایک دَرد کے رشتے میں پروئے ہوئے اَفکار شعریت میں ڈھلے ہوئے قاری کو اپنی گرفت میں لیتے چلے جاتے ہیں۔

میں اُن کی شاعری پر اور زیادہ تفصیل سے لکھتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت مجھے بمبئی لے جانے والی ریل کی روانگی میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ مجھے تیار ہو کے ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ اِس لیے صرف ایک نظم ''تعلیم'' کے چند مصرعے پیش کر کے رُخصت کی اجازت طلب کرتا ہوں:

کوئی ہندو نہ مُسلماں
سبھی مظلوم تھے وہ
صرف مظلوم مرے
کوئی لیڈر نہ مرا
روز ہوتے ہیں فسادات
خبر چھپتی ہے
روز ہم کوئی نئی بستی کا پتا چلتا ہے
اپنی تعلیم میں ہوتا ہے اضافہ ہر روز
بند کر دو ابھی اخبار کی ساری آنکھیں ——

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

یادِ یارِ مہرباں

اگر میرے دوست پروفیسر آفاق احمد مجھ سے یہ فرمائش نہ بھی کرتے کہ اُس کتاب کے لیے جو وہ ممنون حسن خان صاحب کے متعلق مرتب کر رہے ہیں مجھے ممنون صاحب پر مضمون لکھنا ہے تو بھی میرا فرض تھا کہ میں ممنون صاحب پر مضمون لکھوں، بلکہ اُن کی یاد میں مضمون مجھے بہت پہلے لکھنا چاہئے تھا ——— آج ممنون صاحب پر قلم اُٹھاتے ہوئے اس کوتاہی کا مجھے شدید طور پر احساس ہو رہا ہے کہ اپنا یہ فرض یا قرض ادا کرنے میں بہت تاخیر میں نے کر دی ہے۔

اس وقت جب میں اپنی کوتاہی کے اس احساس میں گرفتار ہوں مجھے یہ بھی خیال آ رہا ہے کہ ممکن ہے اس وقت تک ممنون صاحب کی یاد میں مضمون نہ لکھنے کا سبب یہ بھی ہو کہ اُن کی شخصیت ہی مضمون لکھنے کی راہ میں حائل رہی ہو۔ اُن کی شخصیت ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح تھی جس کے ہر پہلو کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ ایک عالمِ بے بدل تھے۔ فارسی کے ہزاروں شعر اُنھیں ازبر تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقبال کا اُردو اور فارسی کلام اوّل سے آخر تک اُنھیں ازبر ہے۔ ان اشعار کا استعمال وہ اپنے خطوط میں اس طرح

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کرتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی اشعار سے مرصّع تحریریں یاد آجاتی تھیں۔ ممنون صاحب کی اور میری خط و کتابت ایک مسلسل ضابطہ حیات کی طرح تھی۔ اُن کے بیسیوں خطوط مجھے موصول ہوئے ہوں گے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ جواب دینے کے بعد میں نے وہ تمام خطوط انجمن ترقی اُردو (ہند) کی لائبریری میں داخل کر دیئے۔ اگر اس وقت اُن کا کوئی مکتوب میرے سامنے ہوتا تو میں اُس میں سے اقتباس لے کر اپنی اس تحریر کو سجا دیتا۔

ممنون صاحب ایک ایسے محبت کرنے والے دوست اور بزرگ تھے جن کے متعلق علامہ اقبال کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے ؎

انجمن میں بھی میسّر رہی خلوت اُس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق!

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق!

اب اقبال کا ذکر آ گیا ہے تو یہاں یہ بیان کرنا بلاسبب نہیں ہوگا کہ وہ ایک سچے عاشقِ اقبال تھے۔ ایسے عاشقِ اقبال نہیں جو اقبال کا نام لے کر اپنی پبلسٹی کے کام میں مصروف رہے ہوں یا جب اقبال صدی تقاریب شروع ہوئی ہوں تو وہ سب سے بڑے "اقبالیے" بن کر میدان میں کود دے ہوں خواہ وہ اقبال کا ایک مصرع بھی موزوں پڑھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور جب اُن کے خیال میں اقبال صدی تقاریب کے پروگرام ختم ہو گئے ہوں تو انھیں سانپ سونگھ گیا ہو ——— اور پھر کہاں کا اقبال اور کہاں کی اقبالیات! لیکن ممنون حسن خان ایسے اقبال مند تھے کہ اپنے دوست عزیز قریشی صاحب کے ساتھ مل کر شیش محل کے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سامنے والے میدان کو اقبال میدان میں تبدیل کرایا، اور اس میں ایک بلند مینار بنوا کر اقبال کی شاعری کے ایک سمبل ''شاہین'' کو اس کی بلندی پر بٹھایا۔ اقبال ادبی مرکز کی بنیاد ڈالی جس کے زیر اہتمام اقبال کے فکر و فن پر سمینار آج تک بڑی باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہو رہے ہیں اور ان سمیناروں میں پڑھے ہوئے مقالات کتابی صورت میں شائع ہو کر اُس لٹریچر میں مسلسل اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں جسے اقبالیات کہتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں اقبال ادبی مرکز کے انتظامیہ جلسے بھی انتہائی باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوتے رہے۔ اُس وقت کے وزیر اعلیٰ سے اُنھوں نے اقبال سمان نامی ایوارڈ جاری کرایا جس کی مالیت پہلے پچاس ہزار تھی اور بعد میں ممنون صاحب کی کوششوں سے ایک لاکھ روپیہ ہو گئی۔

اقبال جب بھی بھوپال آتے تھے خواہ وہ سرراس مسعود کے مہمان ہوں اور خواہ حکومتِ بھوپال کے مہمان، ممنون حسن خاں کو اُن کی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ اقبال نے اپنے اکثر اشعار جو اُن کے قیام بھوپال کے دوران میں موزوں ہوئے اوّل اوّل ممنون حسن خان ہی کو لکھوائے۔ اتنے بڑے شاعر سے اتنا قُرب ——— ع۔ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے' ایک ہم تھے کہ لاہور میں رہنے کے باوجود اس کوہِ وقار شاعر کی خدمت میں حاضر ہونے کا حوصلہ نہ کر سکے اور

عینِ وصال میں تجھے حوصلہ ء نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب

کا ورد کرتے رہ گئے۔

اقبال سے اس قدر قُرب کے باوجود ممنون حسن خان نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اقبال سے ملنے والوں میں تھے یا اُن کے احباب میں تھے حالانکہ اقبال کے انتقال کے بعد لاہور میں اکثر لوگوں نے یہ جھوٹا دعویٰ کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اقبال سے اکثر ملا کرتے تھے، اقبال اُن کے دوست تھے، اقبال نے اُن سے یہ کہا وہ کہا، اُن کے لیے یہ کیا وہ کیا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

لیکن حقیقت زیادہ سے زیادہ یہ رہی ہوگی کہ اُنھوں نے آتے جاتے کہیں اقبال کی ایک جھلک دیکھ لی ہوگی۔ اُن میں سے ایک صاحب تو مدتوں کلکتے میں رہے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا اور دُوسرے بمبئی میں ہیں اور بعض اور بھی ہیں جو اس دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ اُن لوگوں کو ایسے جھوٹے دعوے کرتے ہوئے یہ بھی خیال نہ آیا کہ اللہ نے قرآن پاک میں جھوٹے پر لعنت بھیجی ہے۔ ہاں یاد آیا ایسے لوگوں کے بارے میں علامہ اقبال کے انتقال کے بعد کنہیا لال کپور نے علامہ ظہور (یا علامہ غفور) کے زیرِ عنوان ایک انشائیہ لکھا تھا جس میں اس طرح کے دروغ گو لوگوں کو خوب لتاڑا تھا۔

اس وقت مجھے حیدرآباد (دکن) کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ حیدرآباد میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام اقبال انٹرنیشنل سیمینار منعقد ہوا۔ سن تو مجھے یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ پاکستان سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تشریف لائے تھے۔ سعودی عرب سے جو صاحب آئے تھے وہ میرے دوست ہیں لیکن اُن کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔ اُنھوں نے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ اقبال ہی پہ لکھا ہے جس پر کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی نے انھیں ڈگری دی ہے۔ سوویت یونین سے جو صاحب آئے تھے اُن کا علم اقبال کے بارے میں واجبی سا تھا۔ ہم تو اس خیال میں تھے کہ سوویت یونین سے پریگارینا تاشا آئیں گی یا سوخوچوف یا چیلی شیو یا لدمیلا وسیلیوا لیکن کوئی غیر معروف صاحب آ گئے تھے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سوویت یونین میں کن لوگوں نے اقبال پر معیاری کام کیا ہے۔ ہندوستان سے آلِ احمد سرور، علی سردار جعفری، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ممنون حسن خان، یہ خاکسار، آندھرا پردیش کے اقبال شناس اہلِ قلم حضرات اور دُوسری زبانوں سے متعدد اقبال اسکالر شریک تھے۔ اس سیمینار میں جب ممنون صاحب کی مقالہ پڑھنے کی باری آئی تو اُن کا تعارف بڑے تعریفی انداز میں کرایا گیا اور کہا گیا کہ آپ علامہ اقبال کے ساتھ بیٹھنے والوں میں ہیں، اُنھوں نے اقبال کی آنکھیں دیکھی ہیں، انھیں علامہ اقبال کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

وغیرہ وغیرہ ——— اور یہ سب حقیقت پر مبنی تھا، اس میں کوئی مبالغہ نہیں تھا لیکن ممنون صاحب نے مائکروفون پر آتے ہی کہا کہ حضرات، تعارف کرانے والے میرے کرم فرمانے بہت مبالغے سے کام لیا ہے۔ میں نقاد نہیں ہوں، عالم نہیں ہوں کہ اقبال ایسے عظیم شاعر پر قلم اُٹھا سکوں۔ آپ نے یاد فرمایا ہے تو میں چند یادوں پر مشتمل مضمون لے آیا ہوں وہ میں پیش کیے دیتا ہوں ——— اور یہ بات کہ میں علامہ کے ساتھ بیٹھنے والوں میں تھا یا ملنے والوں میں تھا بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہے۔ میں علامہ اقبال کا ایک غلام تھا، ایک نیاز مند تھا، اُن کا ایک خادم تھا، اُن کا کفش بردار تھا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اُن کے بوٹ کے تسمے باندھتا تھا۔ بڑی عقیدت سے کھانا اور چائے اُن کے سامنے لا کر رکھتا تھا اور اسے اپنے لیے بڑا اعزاز سمجھتا تھا۔ یہ کہتے کہتے وہ گلوگیر ہو گئے ——— اور اس وقت جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں میں بیان نہیں کر سکتا کہ سیمینار میں حاضرین کی کیا حالت تھی۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا اور اپنے محترم دوست ممنون حسن خان کی یہ کسر نفسی دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بھوپال ہی کی بات ہے۔ میں اُن کے گھر میں اُن کے ساتھ بیٹھا چائے کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی عالمانہ باتوں سے بھی لذت اندوز اور مستفید ہو رہا تھا کہ اُن کے فرزند ارجمند کیمرہ لے کر آئے اور اُنھوں نے میری اور ممنون صاحب کی مشترکہ اور الگ الگ کئی تصویریں کھینچیں۔ اس کے دوسرے یا تیسرے ہفتے جموں میں مجھے بھوپال سے تصویروں کا ایک پلندہ موصول ہوا جس میں وہ تمام تصویریں تھیں جو کھینچی گئی تھیں۔ کچھ مدت بعد پھر بھوپال کا سفر سامنے تھا۔ بھوپال پہنچ کر میں جب اُن سے ملنے گیا تو ممنون صاحب اپنے ذخیرۂ تصاویر میں سے ایک تصویر نکال لائے جس میں وہ اور میں دونوں موجود تھے۔ وہ تصویر مجھے دکھا کر اُنھوں نے پوچھا کہ یہ تصویر بھی آپ کو ملی ہے؟ میں نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے اس تصویر کے لیے کوئی موزوں شعر مجھے لکھوا دیں تا کہ یہ تصویر جہاں بھی چھپے اسی شعر کے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ساتھ چھپے۔ میں نے دو چار منٹ توقف کیا اور حافظے کے نہاں خانے سے علامہ اقبال کا یہ شعر نکال کر انھیں پیش کر دیا ؂

محبت چوں تمام اُفتد رقابت از میاں خیزد
بہ طوفِ شعلہ پروانہ با پروانہ می سازد

شعر سُن کر پھڑک اُٹھے اور کہنے لگے آزاد صاحب، کیا بتاؤں یہ شعر سُن کر میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے علامہ اقبال نے یہ شعر میرے اور آپ کے لیے لکھا ہے۔ ہم دونوں اقبال کے عاشق ہیں یعنی ہمیں ایک دوسرے کا رقیب ہونا چاہیے لیکن ہم میں کوئی رقابت نہیں ہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہماری دعوت پر آپ اتنی دور سے تشریف لاتے ہیں۔ کہاں کشمیر، کہاں بھوپال۔ اب یہ تصویر اسی شعر کے ساتھ چھپے گی۔ گویا شعر تلاش کرتے وقت میرا جذبۂ دل جس ''حال'' میں تھا وہ ''قال'' بن کر اُن کی زبان پر آ گیا۔

مجھے نہیں معلوم اُنھوں نے یہ تصویر کہاں بھیجی اور یہ کہاں شائع ہوئی لیکن جب میرے عزیز دوست ڈاکٹر خلیق انجم ''جگن ناتھ آزاد: حیات اور ادبی خدمات'' مرتب کر رہے تھے تو میں نے اُنھیں یہ تصویر اس شعر کے ساتھ بھیجی اور گذارش کی کہ یہ تصویر آپ کی کتاب میں اسی شعر کے ساتھ چھپنا چاہیے کیونکہ اب یہ تصویر اس شعر کے ساتھ میرے لیے یادِ محبوب کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ تصویر مذکورہ کتاب میں اسی شعر کے ساتھ شائع ہوئی۔

ہمارے مُلک کا اور ہمارے دور کا یہ رواج ہے کہ ہر اچھا کام کرنے والے کی شخصیت کسی نہ کسی حد تک متنازعہ فیہ ہو جاتی ہے۔ یہی بات ممنون صاحب کے ساتھ بھی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے اپنی تحریروں سے اُن کے کام پر پانی پھیرنا چاہا۔ ممنون صاحب کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی۔ اُنھوں نے اپنے دفاع میں متعدد اخبارات کو خطوط لکھے۔ اخباروں نے اُن کے ساتھ پورا تعاون کیا اور اُن کے خطوط قطع و برید کے بغیر شائع کیے۔ انجمن ترقی اُردو

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

(ہند) کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" نے اس سلسلے میں اُن کے تمام خطوط شائع کیے۔ ایک بار علامہ اقبال کے ساتھ اُن کے فرزندِ ارجمند جاوید اقبال بھی بھوپال آئے تھے۔ ممنون صاحب نے اُنھیں بھی خط لکھا۔ جاوید صاحب نے جواب میں ایک طویل خط اُنھیں لکھا جس میں اس بات کی شہادت درج تھی کہ علامہ اقبال کے دل میں ممنون صاحب کے لیے بڑی جگہ تھی۔ لاہور میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ بات چیت میں یہ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال ممنون صاحب کا ذکر بڑی محبت سے کر رہے ہیں۔ جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے وہ ممنون صاحب کو کتنا چاہتے تھے اس بات کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سَر راس مسعود کے انتقال پر علامہ اقبال نے تعزیت کا خط ممنون صاحب کے نام لکھا اور اس خط میں اس طرح کی بات بھی لکھی کہ یہ رُباعی جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں میں نے اپنے لوحِ مزار کے لیے لکھی تھی لیکن مسعود مجھ سے پہلے چلا گیا اس لیے آپ یہ رُباعی اُن کے لوحِ مزار پر کندہ کرا دیجیے۔ وہ رُباعی یہ ہے:

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک　　　همه گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر　　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

مجھے جب ممنون صاحب نے یہ خط دکھایا تو میں نے کہا ممنون صاحب، آپ کے لیے تو یہ خط ایک بہت قیمتی دستاویز ہے، اوّل سے آخر تک، لیکن میرے لیے تو یہ اس سے بھی زیادہ بڑا علمی خزانہ ہے۔ اُنھوں نے پوچھا وہ کیسے؟ میں نے کہا بحرِ ہزج کے جس زحاف[1] (مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیل) یا (مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن) میں علامہ اقبال نے یہ رُباعی کہی ہے اسی زحاف میں "پیامِ مشرق" اور "بالِ جبریل" میں اُن کی بیسیوں رُباعیاں موجود ہیں۔ رُباعی کے مروّجہ (TRADITIONAL) زحافات میں جن کی تعداد چوبیس ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ، علامہ مرحوم کی صرف چار یا پانچ رُباعیاں ہیں۔ تین اُردو میں اور ایک یا

---

[1] ہزج مثمن سالم محذوف الآخر

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

دو فارسی میں[1] لیکن ان مذکورہ بیسیوں رُباعیات میں سے کسی پر اُنھوں نے ''رُباعی'' کا لفظ نہیں لکھا اور اس وجہ سے اس زحاف میں کہی ہوئی اقبال کی رُباعیاں ہمیشہ بحث مباحثے کا موضوع رہی ہیں۔ یہ بحث تقسیم ہند سے قبل شروع ہوئی اور آج تک جاری ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے اکثر نقاد دوست کہتے ہیں کہ یہ قطعات ہیں رُباعیات نہیں ہیں۔ میرا جواب ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جن میں مطلع موجود ہے (اور زیادہ تر رُباعیات میں مطلع ہے) اُنھیں آپ قطعہ کیسے کہیں گے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اقبال کے بیسیوں قطعات میں سے کوئی قطعہ ایسا دکھا دیجیے جس میں مطلع موجود ہو اور اپنی دلیل کو مضبوط بنانے کے لئے میں اس بات پر بھی مُصر رہا ہوں کہ بابا طاہر عُریاںؔ نے اس زحاف میں (اور دو اشعار میں) جو کچھ کہا ہے اُسے ''رُباعیاتِ بابا طاہر'' کہا جاتا ہے۔ معترضین اکثر یہ جواب دیتے ہیں کہ کتاب کا نام تو ''رُباعیات بابا طاہر'' ناشرین نے رکھا ہے۔ بابا طاہر نے تو اُنھیں رُباعیات نہیں کہا ہوگا۔ معترضین اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں یہ کتاب اُس وقت بھی اسی نام سے شاملِ نصاب رہی جب مولانا اصغر علی رُوحی، مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، مولانا تاجور نجیب آبادی، محمد اقبال، وائس پرنسپل اورینٹل کالج، مولانا علم الدین سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، آقا بیدار بخت اور ڈاکٹر سید عبداللہ ایسے ماہرینِ عروض یونیورسٹی اور کالجوں میں فارسی نظم و نثر پڑھاتے تھے۔ میں تو اس بات کو بھی سند مانتا ہوں کہ ہیرن ایلن نے ان ترجموں پر مشتمل کتاب کا نام ''رُباعیاتِ بابا طاہر'' ہی رکھا ہے۔ جواب دینے والوں کا کہنا یہ ہے کہ ہیرن ایلن نے تو مکھی پر مکھی ماری ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کیا اقبال نے بھی اُنھیں کہیں رُباعیات کہا ہے۔ میرا یہ جواب بھی معترضین کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں کہ ''بالِ جبریل'' میں کسی غزل کو بھی اقبال نے غزل نہیں کہا ہے۔ ''زبورِ عجم''

---

[1] مثلاً مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع یا مفعولن فاعلن مفاعیلن فع وغیرہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میں ایک سو سے زیادہ غزلیں ہیں لیکن کسی پر لفظ ''غزل'' لکھا ہوا نہیں ملتا۔ ہاں طویل نظم ''گلشن رازِ جدید'' کے پانچ اشعار پر مشتمل ایک حصے پر لفظ ''غزل'' لکھا ہے۔ تو جن غزلوں پر اُنھوں نے غزل کا عنوان نہیں دیا کیا وہ غزلیں نہیں ہیں ——— اب ممنون صاحب، اس مکتوب میں جو اس وقت میری نظر کے سامنے ہے علامہ نے خود اس صنف کو زبانی کہا ہے۔ اس خط کی نقول تو اسی طرح فوٹو اسٹیٹ کے ذریعے سے نہیں بلکہ کیمرے کے ذریعے سے تیار کرا کے معیاری جرائد میں چھپوانا چاہئیں کیونکہ فوٹو اسٹیٹ میں تو گڑبڑ کا امکان ہے اس لیے معترضین کو یقین دلانے کے لیے فوٹو اسٹیٹ کاپی کافی نہیں بلکہ کیمرے کے فوٹو کا موجود ہونا ضروری ہے۔

اقبال ادبی مرکز کے ایک سیمینار کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے جس سیشن میں صدارت کے فرائض انجام دیئے اُسی میں اُنھوں نے اپنا مقالہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مقالے میں غلط بیانیاں بھی تھیں اور خود ستائی کے پہلو بھی نمایاں تھے۔ ممنون صاحب میرے قریب بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ صاحب غلط بیانی سے بھی کام لے رہے ہیں اور خود ستائی کا رویہ بھی اختیار کیے چلے جا رہے ہیں۔ اقبال کے متعلق جو میٹر ہندوستان میں ملتا ہے اُس کے متعلق اُن کا یہ کہنا کہ اس میٹر کی تلاش کے لیے میں برطانیہ گیا وغیرہ وغیرہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ممنون صاحب نے فرمایا کہ جب ان کا مقالہ ختم ہو جائے تو آپ مناسب لفظوں میں اس پر تنقید کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا مشکل یہ ہے کہ صدارت بھی یہی صاحب کر رہے ہیں، اور علمی اور ادبی جلسے میں صدر کا کام اپنے تبصرے کے ذریعے ROUND UP پیش کرنا ہوتا ہے نہ کہ پہلے کے لکھے ہوئے مقالے کو خطبہ صدارت کے طور پر پیش کرنا۔ علمی اور ادبی سیمینار اور سیاسی نوعیت کے جلسوں میں فرق ہوتا ہے اور یہ حضرت علمی سیمینار میں سیاسی جلسوں کا انداز اختیار کیے چلے جا رہے ہیں۔ ممنون صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ صاحب صدر بھی مہمان تھے۔ تھوڑی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

دیر بعد ممنون صاحب نے مجھ سے کہا کہ اُن کا مقالہ ختم ہو جانے کے بعد آپ اُن کی خامیوں کو نمایاں کیے بغیر صرف کام کی بات ہی مائکروفون پر کہہ دیجیے گا۔ میں نے کہا ممنون صاحب سیمنار کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ دُنیا بھر میں کہیں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ سیمناروں میں خطبہء صدارت کے بعد کوئی مقرر مائک پر آ کر کچھ کہے۔ ہاں شکریہ ادا کرنے کے لیے منتظمین میں سے کوئی شخص خطبہء صدارت کے بعد مائک پر آ سکتا ہے۔ اس لیے میں تو ''خطبہء صدارت'' کے بعد مائکروفون پر آ کر صاحب صدر کے خطبے پر اعتراض کر کے سیمناروں کے آداب کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں بعض لوگوں کو یہ اعتراض کرنے کا موقع مل جائے گا کہ خطبہء صدارت کے بعد فلاں شخص نے آ کر صدر کے ''فرمودات'' کی تردید شروع کر دی اور وہ لوگ یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ اس طرح تقریر کرنے والے نے سیمنار کے آداب کا خیال نہیں کیا۔ اب آپ اس کے بعد شکریہ ادا کر دیں یا منتظمین میں سے کسی سے یہ فرض ادا کرنے کے لیے کہہ دیں اور آئندہ سیشن کے لیے کوئی اعلان کرنا ہو تو وہ صاحب یہ اعلان بھی کر دیں۔

دُوسرے دن میں ابھی ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، ریسپشنسٹ کہہ رہی تھی کہ ممنون صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہا میں ابھی ایک منٹ میں نیچے حاضر ہوتا ہوں کیونکہ لفٹ نہیں ہے اور سیڑھیوں سے ممنون صاحب کا اُوپر کی منزل پر آنا اُن کی صحت کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ چنانچہ میں نیچے گیا۔ ہم دونوں لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ ممنون صاحب نے بات شروع کرتے ہی کہا کہ میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں نے کہا آپ میرے بڑے بھائی ہیں آپ ایسی بات کیوں کہہ رہے ہیں اور میں سمجھا بھی نہیں کہ موضوعِ گفتگو کیا ہے۔ کہنے لگے کل شام کو آخری سیشن کے بعد بعض حضرات میرے پاس آئے اور اُنھوں نے ''خطبہء صدارت'' کے بارے میں وہی بات کہی جو آپ نے مجھ سے کہی تھی۔ میں نے کہا وہ تو سامنے کی بات تھی۔ جس مواد کے بارے میں وہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کہہ رہے تھے کہ انھیں انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں دستیاب ہوا وہ لاہور اور کراچی کی کتابوں میں چھپ چکا ہے۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ جو حضرات میرے پاس آئے وہ یہ چاہتے تھے کہ "خطبہ صدارت" پر سوال جواب ہوں اور جب آپ اور میں ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے تو اُن لوگوں نے یہ اندازہ کیا کہ آپ خطبے کے بارے میں کچھ کہیں گے اور اس کے بعد خطبے پر سوال جواب شروع ہو جائیں گے۔ میں نے تو آپ سے کہہ دیا تھا کہ "آپ مختصر الفاظ میں چند جملے کہہ دیں۔ مجھے تو اندازہ نہیں تھا کہ آپ کچھ کہیں گے تو "خطبہ صدارت" پر اعتراضات کا دروازہ کھل جائے گا۔ آپ نے میرے ساتھ اتفاق نہ کر کے حقیقتاً صورتِ حال کو سنبھال لیا ورنہ ہمارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ آپ نے جس خلوص اور محبت سے کام لیا میں اُس کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔" یہ کہہ کے وہ مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ میں یہ ساری صورتِ حال دیکھ کے ہکا بکا رہ گیا اور میرے منہ سے اتنا ہی نکلا کہ برادر محترم آپ کا سیمینار میرا اپنا سیمینار ہے۔ میں اگر یہاں مہمان کے طور پر بھی آتا تو جو کچھ کل آپ کے کان میں کہا وہ اس وقت بھی آپ کے کان ہی میں کہتا۔ مائکروفون پر تو کہنے کا سوال ہی نہیں اور آپ نے تو مجھے علامہ اقبال ادبی مرکز کے فاؤنڈر ممبر کا اعزاز دیا ہے تو میری حیثیت یہاں میزبان کی ہے۔ میں اس طرح کی بات تمام سامعین کے سامنے کبھی نہ کہتا، آپ نے شکریہ ادا کرنے کے لیے یہاں تک آنے کی جو زحمت کی ہے اُس سے مجھے بڑی ندامت کا احساس ہو رہا ہے اور اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں، اس وقت جوش صاحب کا صرف ایک شعر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ؎

بہت جی خوش ہوا اے ہمنشیں کل جوشؔ سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

میرے ساتھ اس واقعے کا ذکر قبلہ ممنون صاحب نے کئی اور ملاقاتوں میں بھی کیا۔ یہ طویل داستان سنانے سے محض یہ بتانا مقصود ہے کہ ممنون صاحب تحمل اور بُردباری کا ایک

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

مجسمہ تھے، وہ تحمل، بُردباری اور ضبط کو ہنگامہ آرائی پر ترجیح دیتے تھے اور اپنے مہمانوں کا پوری طرح سے احترام کرتے تھے۔ اس واقعے میں بھی مذکورہ صاحب صدر کے احترام کا پہلو نمایاں ہے۔

اس کے ساتھ ہی ملتی جلتی بات یہ ہے کہ ممنون صاحب اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع، اُن کے قیام وطعام اور آرام کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممنون صاحب خوش نصیب تھے کہ اُنھیں رفیقِ کار بھی ایسے ملے جو بیٹوں کی طرح اُن کا احترام کرتے تھے اور اُن کا انتظامی ذمہ داریوں کا قریب قریب سارا بوجھ سنبھال لیتے تھے۔ اُن رفقائے کار میں دو نام آسمانِ ادب پر ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور وہ نام ہیں پروفیسر آفاق احمد اور مرحوم فضل تابش!

آج ممنون صاحب ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کے کارنامے جن میں اقبال سمنان، اقبال ادبی مرکز کا قیام اور اُردو اکیڈیمی مذہبیہ پردیش بہت بڑے کام ہیں جو اُنھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ علامہ اقبال سے اُنھیں جو عقیدت تھی اس کے پیشِ نظر یہ بات نامناسب نہ ہوگی کہ اُن کی یاد میں یہ مقالہ میں اقبال کے اُن اشعار پر ختم کروں جو اُنھوں نے حیاتِ جاوداں کے موضوع پر کہے ہیں ؎

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر — جوشِ اُلفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں — رُوح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں — یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

عقل جس دم دہر کی آفات میں مخمور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل ہوئے منزل سفر

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزوئے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیِ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو
جادو دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کرشن کانت

(ایک اُردو دوست)

آنجہانی کرشن کانت جب تک دہلی میں پارلیمنٹ کے ممبر رہے میری اُن سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے اُن سے میری ملاقات حیدرآباد میں ہوئی جب وہ آندھرا پردیش کے گورنر تھے۔

ہُوا یوں کہ ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی کی ورکنگ کمیٹی نے (جس کے عزیز قریشی صاحب صدر تھے اور میں ایک رُکن) یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ قریشی صاحب کے ہمراہ حیدرآباد، بنگلور، بمبئی اور مدراس جائیں اور ان ریاستوں کے گورنروں، وزرائے اعلیٰ اور وزرائے تعلیم سے ملاقات کریں تاکہ ایک مقام پر ہمیں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی کے لئے زمین مل سکے اور باقی تین مقامات پر یونی ورسٹی کے تعلیمی مرکزوں R.S.Cs کے لئے۔ اس سلسلے میں ہمیں خداوند کریم کے فضل و کرم اور عزیز قریشی صاحب کی کوششوں اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے ہر جگہ کامیابی ہوئی۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

حیدرآباد میں ہم پہلے وزیرِ اعلیٰ سے ملے۔ اُنھیں مائل بہ کرم پا کر اُنھی کے مشورے سے ہم وزیرِ تعلیم سے ملنے گئے۔ وزیرِ تعلیم اپنے دفتر میں نہیں تھے۔ ہم اُن کے پی۔ اے سے یہ کہہ کر اب ہم گورنر صاحب سے ملنے جا رہے ہیں۔ ایجوکیشن منسٹر جب آ جائیں تو ہمیں مطلع کر دیں تاکہ ہم اُن سے مل لیں۔

وہاں سے ہم گورنر صاحب یعنی کرشن کانت جی سے ملنے کے لئے راج بھون پہنچے۔ یہاں ہمارے ساتھ شانتی رنجن جی نہیں تھے۔ عزیز قریشی صاحب اور کرشن کانت صاحب کے تو پہلے ہی سے ایک دُوسرے کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ میں پہلی بار اُن سے مل رہا تھا۔ وہ مُجھ سے بھی خلافِ توقع بڑے تپاک سے ملے۔ مُجھے اس پر کچھ حیرت بھی ہوئی ——— اتنے میں چائے وغیرہ آ گئی اور جس مقصد کے لئے ہم آئے تھے اُس کے پیشِ نظر بات چیت شروع ہو گئی۔ اس بات چیت میں اُنھوں نے بھی ہمیں یقین دلایا کہ یونی ورسٹی کے لئے جتنی زمین آپ کو درکار ہو گی حیدرآباد میں آپ کو ملے گی۔ یہ بات چیت ختم ہی ہوئی تھی کہ گیسٹ ہاؤس سے جس میں ہم مقیم تھے ٹیلی فون آیا کہ وزیرِ تعلیم، قریشی صاحب سے اور آزاد صاحب سے ملنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ چونکہ گورنر صاحب بھی وزیرِ اعلیٰ کی طرح زمین کے بارے میں ہمیں یقین دلا چکے تھے اُنھوں نے قریشی صاحب سے کہا کہ آپ تو اب گیسٹ ہاؤس ہی جائیں گے اس لئے آپ وزیرِ تعلیم سے کہہ دیجئے کہ زمین دینے کے معاملے میں گورنر اور وزیرِ اعلیٰ نے ہم سے وعدہ کر لیا ہے۔ جس کام کے لئے آپ آئے ہیں وہ تو ہو گیا۔ اب آپ آزاد کو یہاں چھوڑ جائیے۔

مُجھے اس پر مزید حیرت ہوئی کہ نہ جانے یہ کیا معاملہ ہے۔ اب گورنر صاحب نے پہلی بات یہ کہی کہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ آ رہے ہیں اور میں تین دن سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ اب میری حیرت تو بڑھتی جا رہی تھی لیکن میں نے اس کا اظہار نہ کیا اور اُنھوں نے بات چیت میں اپنے والدِ محترم لالہ اُجنت رام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ لالہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اُچنت رام اپنی زندگی کے آخر تک لالہ لاجپت رائے کی یاد میں پنجاب کے کسی نہ کسی شہر میں مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے اور محروم صاحب ہر مشاعرے میں تشریف لاتے تھے۔ میں نے اتنا ہی کہا جی ہاں محروم صاحب نے لالہ لاجپت رائے سے متعلق ایک نظم لالہ اُچنت رام کے مشاعرے کے لیے کہی تھی۔ کرشن کانت جی نے کہا کہ میں لالہ لاجپت رائے سے متعلق مذکورہ مشاعروں میں محروم صاحب کی دو یا تین نظمیں سُن چکا ہوں۔ میں اُردو شاعری سے ان کی یہ دل چسپی دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ کرشن کانت جی لالہ اُچنت رام کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ میں نے صرف اتنا ہی کہا کہ محروم صاحب کی یہ نظمیں "بندے ماترم" میں شائع ہوئیں۔ اس پر کرشن کانت جی نے کہا کہ آپ کو شاید "بندے ماترم" والا قصہ معلوم نہیں ہے۔ میں نے جواب میں اتنا ہی کہا کہ لالہ اچنت رام نے والدِ محترم سے فرمائش کی تھی کہ آپ "بندے ماترم" کے اڈیٹر کے طور پر لاہور آ جائیں، اس پر گورنر صاحب نے کہا کہ دراصل یہ فرمائش لالہ لاجپت رائے کی طرف سے تھی۔ اُنھوں نے لالہ اچنت رام سے کہا تھا کہ محروم صاحب سے کہیے کہ "بندے ماترم" ابھی شروع نہیں ہوا ہے۔ چند روز میں یہ شروع ہوگا۔ وہ اس کا اڈیٹر بننے کی ہامی بھریں تو پہلا ہی شمارہ اُن کی اڈیٹر شپ میں شروع کیا جائے۔ محروم صاحب نے جواب میں لالہ اچنت رام کو لکھا کہ ایک تو میں بیمار رہتا ہوں، ہرنیا اور بواسیر پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہیں اور ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جب میں ایک ایسے اخبار کا اڈیٹر مقرر ہوں گا جو کانگریس کا اخبار ہوگا تو جیل جانے کی نوبت اکثر آئے گی۔ یہ دو بیماریاں مجھ سے ویسے ہی نہیں سنبھلتیں جیل خانے میں یہ مجھے اور پریشان کریں گی۔

مجھے کرشن کانت جی کے حافظے پر اور پھر اُردو کے تعلق سے اُردو کے شاعر محروم صاحب اور اپنے والدِ محترم لالہ اچنت رام کی باہمی خط و کتابت کی تفصیل یاد رکھنے پر ایک مسرّت آمیز حیرت ہوئی۔ حیرت تو اُن کے حافظے پر ہوئی اور چوں کہ یہ واقعہ اُردو کے تعلق سے تھا اس لیے یہ میرے لیے مسرّت آمیز حیرت تھی۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

وقت کافی ہو رہا تھا اور میں نے اجازت طلب کی تا کہ گیسٹ ہاؤس پہنچ کر عزیز قریشی صاحب اور وزیرِ تعلیم کی باہمی بات چیت کے بارے میں واقفیت حاصل کروں۔

میں ابھی اُٹھا ہی تھا کہ اُن کے پرسنل اسسٹنٹ نے کہا ''آپ کے لیے گورنر صاحب کے اسپیشل سکریٹری نے کہا ہے کہ وہ آپ کے انتظار میں ہیں، اُن سے مل کے جایئے۔'' چنانچہ پرسنل اسسٹنٹ مجھے اسپیشل سکریٹری کے کمرے میں لے گیا۔ کیا دیکھتا ہوں وہاں میرے پرانے عزیز دوست کے۔ایل۔ گاندھی' جن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ گورنر آندھرا پردیش کے اسپیشل سکریٹری ہیں' موجود ہیں اور میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میرا کچھ وقت وہاں گزرا اور وہاں سے میں گیسٹ ہاؤس پہنچا۔ یہ کرشن کانت جی سے میری پہلی ملاقات تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے آپس میں فیصلہ کیا کہ حیدر آباد میں راقم التحریر کا جشن منایا جائے۔ تاریخ طے ہو گئی اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ڈاکٹر خلیق انجم کو اطلاع دی کہ مصروفیات کے باوجود کرشن کانت جی نے جشنِ آزادی کی صدارت کرنا منظور کر لیا ہے۔ دہلی سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ مجھے اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئے۔ اب یہاں میں جشن کی روداد بیان کرنے سے تو رہا، ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ جشن کی ابتدا سے ذرا پہلے جب اہلِ قلم حضرات اور سامعین حضرات کافی تعداد میں آ چکے تھے اطلاع ملی کہ گورنر صاحب پہنچ گئے ہیں اور جلسہ گاہ میں آ رہے ہیں تو میں احتراماً اُٹھ کے باہر دروازے تک گیا اور راقم التحریر کے آداب کرنے سے پیشتر ہی اُنھوں نے راقم التحریر کے ساتھ معانقہ کیا، جشن کی مبارک باد دی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر دائس پر پہنچے۔

اس جلسے کی صدارتی تقریر میں کرشن کانت جی نے اس خاکسار کی شاعری کے علاوہ اس کے علامہ اقبال سے متعلق چھوٹے موٹے کام کا خاص طور سے ذکر کیا اور یہاں تک کہا کہ میں اقبال کے تعلق سے اُتنا ہی جانتا ہوں جتنا جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتابوں میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

لکھا ہے۔

میں اب عمر کے اس حصے میں ہوں جس حصے میں غالبؔ نے اپنے متعلق کہا تھا ۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ

اب عناصر میں اعتدال کہاں

(دراصل قضاوقدر کے فرشتوں نے یہ شعر میرے تخلص کے ساتھ موزوں کر کے عالمِ بالا سے میرے لیے بھیجا تھا۔ رستے میں مجھ سے مرزا غالبؔ نے لپک کے لے لیا اور اپنا لیا)۔ چنانچہ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ واقعات تو اکثر یاد ہیں لیکن تاریخیں یاد نہیں، اس لیے بعض واقعات آگے پیچھے ہو سکتے ہیں۔ اس خاکسار کے اعزاز میں حیدرآباد میں ایک جلسہ تھا۔ اس میں کرشن کانت جی' خود تو تشریف نہیں لائے تھے ایک بہت خوب صورت پیغام اُنھوں نے لکھ کے بھیجا تھا جو جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ یہ توصیلی پیغام غالباً میرے کاغذات میں کہیں موجود ہے اور ہو سکتا ہے کسی مضمون میں شریکِ اشاعت ہو۔ اس جلسے کی ایک بات مجھے ابھی تک یاد ہے وہ یہ ہے کہ اُردو کے معروف طنز نگار نریندر لوتھر نے اس خاکسار کے بارے میں ایک بہت عمدہ مقالہ پڑھا تھا۔ میں اُس زمانے میں سوویت یونین کی چار یونیورسٹیوں میں اُردو پر اور علامہ اقبالؔ پر لکچر دے کے واپس آیا تھا۔ کچھ مدت بعد سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا۔ لوتھر صاحب نے اپنے مقالے میں اس خاکسار کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''جگن ناتھ آزاد نے سوویت یونین کی چار
یونیورسٹیوں میں چار لکچر دیے۔ اس کے بعد سوویت یونین کا
جو حشر ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔''

اس پر سارا ہال تالیوں اور قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

لیجیے ایک اور ملاقات جو پہلے یاد آنا چاہیے تھی اب یاد آ گئی ہے۔ حیدرآباد کے ایک سفر میں جس میں ڈاکٹر خلیق انجم اور میں اکٹھے شریک تھے، شری کرشن کانت نے ہم دونوں کے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اعزاز میں راج بھون میں ایک شعری تقریب منعقد کی۔ حیدرآباد کے متعدد شعراء اس میں شریک ہوئے۔ اس اعزازی تقریب میں یہ بات روزِ روشن کی طرح نمایاں ہوگئی کہ کرشن کانت جی کا شعر پرکھنے کا معیار کس قدر بلند ہے۔ ہر اچھے شعر پر وہ داد دیتے رہے۔ میں چوں کہ باہر سے آیا ہوا مہمان تھا اس لیے مجھ سے چار پانچ غزلیں، نظمیں سنی گئیں لیکن مقامی شعراء میں سے غالباً کوئی نہیں کہہ سکتا ہوگا کہ کسی شاعر کا کوئی شعر اُنھوں نے بے توجہی سے سنا ہوگا۔ حیدرآباد کے تمام شعراء نے اپنا منتخب کلام سنایا جسے سن کر دلی مسرت ہوئی۔

اس شعری نشست میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اُن سے فرمائش کی کہ اب جب آپ دہلی تشریف لائیں تو اُردو گھر میں علامہ اقبالؔ پر ایک لیکچر دیں۔ اُنھوں نے کہا کہ The Reconstruction of Religious Thought in Islam مجھے نہیں مل سکی۔ یہ کتاب مجھے مل جائے تو اس کتاب کے متعلق لیکچر دوں گا۔ میں نے کہا کہ میرے پاس یہ کتاب موجود ہے لیکن اس پر میرے حواشی درج ہیں اگر آپ پسند کریں تو میں اس کتاب کی زیراکس کاپی آپ کو بھجوادوں۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کے نوٹس اگر اس پر موجود ہیں تو میں اسی نسخے کو ترجیح دوں گا۔ آپ مجھے جاتے ہی بھجوادیں۔ میں نے زیراکس کاپی تو بھجوادی لیکن وہ لیکچر دینے کے لیے دہلی نہ آسکے۔

اس وقت حیدرآباد کی ایک اور ملاقات یاد آرہی ہے۔ اہلِ حیدرآباد کا مجھ خاکسار پر ہمیشہ کرم رہا ہے ——— خاص کر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا۔ ایک دفعہ ان کی تجویز پر اہلِ حیدرآباد نے اس ہیچ مدان کا جشن منایا جس کی صدارت کے لئے گورنر کرشن کانت نے رضامندی دے دی تھی۔ اُن کے آنے سے قبل ہی انجمن ترقی اُردو حمایت نگر کا ہال کچھا کھچ بھر چکا تھا۔ جن حضرات کو اپنے مقالات پڑھنے تھے یا تقریریں کرنا تھیں وہ سب آچکے تھے کہ اطلاع ملی کہ گورنر صاحب کی کار اُردو گھر تک پہنچنے والی ہے۔ چونکہ وہ میرے جشن کی صدارت کے لئے آرہے تھے میں نے سوچا میں باہر جاکر برامدے میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اُن کا خاص طور پر استقبال کروں۔ اِدھر میں برامدے میں پہنچا اور اُدھر سے وہ گاڑی سے اُتر کے برامدے میں آ گئے اور اِنتہائی عالمِ مسرّت میں مجھے مبارک باد دیتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے ڈائس پر لے گئے اور اپنے ساتھ والی کرسی پر پہلے مجھے بٹھایا اور بعد میں خود صدارت کی کرسی پر متمکن ہوئے۔ اِس بات پر کہ وہ اِس زمانے میں کس طرح قدیم اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں مجھے ایسی حیرت آمیز مسرّت ہوئی جسے میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

اُن کے وائس پریذیڈنٹ مقرر ہو کر دہلی آنے کے بعد اُن سے میری اور ڈاکٹر خلیق انجم کی اکثر مشترکہ ملاقاتیں ہوئیں۔ کرشن کانت جی قیامِ حیدرآباد کے زمانے کی طرح اسی طرح ہشاش بشاش نظر آئے۔ بقول اقبال

ع - کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اب یاد نہیں میری وہاں موجودگی میں کس بات پر ڈاکٹر خلیق انجم نے میرا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمارے صدر ہیں'' اُنھوں نے میری طرف مصافحے کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے یہ جملہ کہا کہ ''یہ ہمارے بھی صدر ہیں۔'' اَب نہ جانے اُن کے لفظ ''ہمارے'' سے کیا مراد تھی لیکن وہاں یہ جملہ مزہ دے گیا۔

اب آخری ملاقات ڈیڑھ ماہ پہلے ہوئی۔ یہ بھی یاد نہیں میں کس سلسلے میں دہلی آیا ہوا تھا۔ امین بخارا صاحب کی مرتب کی ہوئی کتاب ''سلام و پیام'' (مشاہیر کے خطوط جگن ناتھ آزاد کے نام) میرے پاس تھی۔ اس کتاب کی ایک جلد میں نے گجرال صاحب کو پیش کی اور دُوسری کے بارے میں سوچا کہ کرشن کانت صاحب کو پیش کروں۔ مجھے اُسی روز واپس جموں جانا تھا۔ اُن کے اسپیشل سکریٹری گاندھی جی کو ٹیلی فون کیا، اُنھوں نے اسی دن کا وقت دے دیا۔ میں مولانا ابوالکلام آزاد روڈ پر پہنچا۔ مجھے اُس کمرے میں بٹھایا گیا جس میں اُن سے مجھے ملاقات کرنا تھی۔ وہ تشریف لائے میں نے اُٹھ کے آداب کیا۔ جواباً اُنھوں نے بھی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

آداب کہہ کے مجھے بیٹھنے کا اذن دیا، وہ بھی بیٹھے۔ چائے آ گئی میں نے ''سلام و پیام'' انھیں پیش کی وہ تھوڑی دیر تک کتاب کی ورق گردانی کرتے رہے اور دو ایک جملے انھوں نے پڑھ کے سنائے۔ میرے ساتھ ان پر بات چیت کی لیکن میں نے اُن کی آواز اور بیٹھنے کے انداز سے یہ محسوس کیا کہ جسم میں وہ توانائی نہیں رہی جو میں نے پہلے کی ملاقاتوں میں دیکھی تھی۔ کوئی پندرہ منٹ ملاقات رہی۔ اُن کی نقاہت کے پیشِ نظر میں نے زیادہ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ اجازت لی۔ وہ اُٹھ کے میرے ساتھ چلے میں نے دو ایک بار یہ کہا بھی کہ آپ تشریف رکھیں لیکن وہ اس دروازے تک مجھے پہنچا کے گئے جہاں سے گارڈ اپنی رہنمائی میں مجھے اندر میٹنگ رُوم میں لے کے گئے تھے۔

باہر آ کر میں گاندھی جی کے چیمبر میں آیا۔ ملاقات کی رُوداد سنائی لیکن یہ بھی کہا کہ آپ تو ہر روز ان سے ملتے ہی ہیں میں نے انھیں پہلی بار اِس کمزوری کی حالت میں دیکھا کہ نقاہت آواز سے بھی ظاہر ہو رہی ہے اور اُٹھنے بیٹھنے کے انداز سے بھی۔

اُسی رات میں جموں واپس لوٹ آیا۔ چند روز بعد صبح ہی صبح میرے بیٹے آدرش نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ رات کو شری کرشن کانت جی کا اِنتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون!

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سَر شنکر لال

بچپن میں دہلی کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا لیکن تقسیم ہند کے بعد جب دہلی میں آ کر بسنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ دہلی جس کی تصویر کتابوں میں دیکھی تھی زُوئے زمین سے قریب قریب ناپید ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس قدیم تاریخی شہر کے گلی کوچے آج بھی اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیب و تمدن کا وہ مرقع جسے کسی زمانے میں دہلی کہا جاتا تھا اور جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دِلّی یاد آتی ہے

وہی عظمت، وہی شوکت، وہی شانِ دلآویزی

آج نظر نہیں آ رہا ہے۔

دہلی کسی بارہ لاکھ یا بیس لاکھ کی آبادی کے شہر کا نام نہیں ہے۔ دہلی نام ہے اُن روایات کا جو ہندوستان کے مشترکہ تمدن کے ماحول میں پروان چڑھیں، جنھیں تاجداروں، امیروں، وزیروں، فقیروں، درویشوں، ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے مل کر آگے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بڑھاپا اور جنھوں نے دہلی کی خاک کے ذرّوں کو ستاروں کی تابانی بخشی۔ ہمایوں کا مقبرہ، جامع مسجد، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، مزار حضرت بختیار کاکیؒ، لال قلعہ، برلا مندر، ہنومان مندر اور جمنا کی لہریں، جن کی تابنا کی سے ہمارے شعر و ادب کی دُنیا جگمگا رہی ہے، پھول والوں کی سیر، غالب اور داغ کی شاعری، شہر کے گلی کوچوں کی شستہ ادبی محفلیں، لوگوں کا اخلاق اور عوام کی شعر و سخن اور آندٹ سے محبت، یہ سب اس تمدن کے مختلف پہلو ہیں جنھیں دہلی کہا جاتا ہے۔

وقت کے سیلاب کے سامنے کوئی نقش اپنی جگہ پر قائم نہیں رہتا۔ مختلف انقلابات کے دوران میں دہلی کے ساتھ بھی یہی عمل ہوا لیکن خاکِ دہلی کا کمال یہ ہے کہ ہر انقلاب میں اور ہر دور میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے ماضی کے ساتھ اپنا رشتہ مودّت برقرار رکھتے ہوئے اُن روایات کو زندہ رکھا جو دہلی کے لیے ہمیشہ مایہ افتخار رہیں۔ ۱۹۴۷ء کا انقلاب اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے اپنی قسم کا واحد انقلاب تھا۔ لیکن دراصل یہ انھی انقلابات کے سلسلے کی ایک کڑی تھی جن سے دہلی اور اہلِ دہلی اکثر دوچار ہوتے رہے ہیں۔ اس انقلاب نے بھی افراد اور جماعتوں کو امتحان میں ڈالا۔ چنانچہ ایسے لوگ اس ہنگامے کی اندھیری رات میں ستاروں کی طرح چمکتے نظر آئے جنھوں نے دہلی کی تہذیب و تمدن، دہلی کی وضع داری اور دہلی کی عظمت کو ایک مقدس ورثہ سمجھا اور اس مقدس ورثے کو دستبرد گردشِ ایّام سے بچانے کے لیے پوری طرح کوشش کرتے رہے۔

سر شنکر لال کا شمار انھیں چند لوگوں میں تھا جنھوں نے دہلی کے پاکیزہ متمدن ماحول میں پرورش پائی۔ اور اسی پاکیزہ متمدن ماحول پر ہمیشہ فخر کیا اور اسے اپنا سرمایہ حیات سمجھا۔

سر شنکر لال کو اُن کی زندگی کے آخری دو برس میں مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُنھیں میں نے جلوت میں بھی دیکھا اور خلوت میں بھی۔ دفتر میں کام کرتے بھی دیکھا اور

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

محفلِ احباب میں بھی۔ اکثر سارا سارا دن بھی اُن کے ساتھ بسر ہوا اور ان تمام ملاقاتوں کے دوران میں اُن کے متعلق میرا ایک ہی خیال پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا کہ آپ غیر معمولی صلاحیتوں کا ایک مجموعہ ہیں' اور ان صلاحیتوں کو بہ درجہ اتم دہلی کی زبان، دہلی کے ادب اور دہلی کی تہذیب کی خدمت کے لیے وقف کر رہے ہیں۔ اور آج جبکہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، میرا اُن کے بارے میں یہ یقین اپنی جگہ پر قائم ہے۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد ہمارے دیس میں اُردو کو جس نازک دور میں سے گزرنا پڑا وہ اہلِ نظر حضرات سے مخفی نہیں ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اکثر حق گو زبانیں مصلحت کے پیشِ نظر خاموش ہو گئی تھیں۔ لیکن سَر شنکر لال اپنے اس عقیدے سے منحرف نہیں ہوئے کہ اُردو ہمارے وطنِ عزیز کی ایک عظیم الشان زبان ہے۔ چنانچہ آپ نے کئی ذرائع سے اس زبان کی بقا اور تحفظ کا سامان پیدا کیا۔ دہلی کی اکثر بڑی بڑی علمی اور ادبی محفلیں اور مشاعرے آپ کے ذوق و شوق اور دستِ کرم کے مرہونِ منت ہیں۔ آپ نے اُردو کے اُس نازک دور میں اُردو کی علمی اور ادبی محفلوں کو کامیاب بنانے کے لیے صرف دامے درمے ہی امداد نہیں کی بلکہ ان میں شرکت کر کے اپنے علمی ذوق کا بھی ثبوت دیا۔ تقسیم کے چند ماہ بعد آپ نے اپنے دولت کدے پر ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا جس میں ہندوستان بھر کے جلیل القدر شعراء نے شرکت کی اور مُلک کے دردمند طبقے پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اتنے بڑے تاریخی انقلاب کے بعد بھی ہماری ادبی روایات بدستور قائم ہیں اور انھیں زندہ رکھنے کے لیے ایک مردِ عمل میدان میں موجود ہے۔

لائل پور کاٹن ملز (پاکستان) کے مشاعروں میں آپ کو میں نے تقسیم سے پہلے بھی دیکھا اور تقسیم کے بعد بھی۔ اور تقسیم کے بعد جس چیز نے مجھے اور غالباً شریکِ مشاعرہ ہونے والے تمام شعراء کو متاثر کیا' وہ یہ تھی کہ کارخانے میں کام کرنے والے لوگوں میں سَر شنکر لال کے لئے محبت اور احترام کا جو جذبہ تقسیم سے پہلے تھا وہی تقسیم کے بعد بھی موجود رہا اور یہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

مقبولیت کا وہ مقام ہے جو کسی کسی کو نصیب ہو سکتا ہے۔ اور اسی سعادت کو دیکھ کر اس مصرعے "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

ان چند سطور میں جو محب مکرم کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور برادرم ساحرؔ ہوشیار پوری کے ارشاد کی تعمیل میں سپردِ قلم کی جا رہی ہیں، اتنی گنجائش نہیں کہ سُرشنکر لال کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے۔ آپ نے وحید العصر حضرت بیخودؔ دہلوی جانشین حضرت داغؔ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ اور ظاہر ہے کہ باکمال اُستاد نے شاگرد کے جوہر قابل کو کس نفاست سے چمکایا ہوگا اور فیضِ نظر کی بدولت سُرشنکر لال کی طبع گہر بار کہاں سے کہاں پہنچی ہوگی۔ کنور صاحب اور ساحرؔ صاحب ہندوستان بھر کے شاعروں اور ادیبوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ وہ مرحوم کے کلام کو یکجا کر کے کتابی صورت میں طبع کرا رہے ہیں اور اس طرح مرحوم کی ایک ایسی یادگار قائم کر رہے ہیں جو کارخانوں، ملوں اور کوٹھیوں سے کہیں زیادہ مستقل اور پائدار ثابت ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۳ء

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

علی سردار جعفری

(یادوں کے آئینے میں)

یہ بات تو یاد ہے کہ علی سردار جعفری سے میری پہلی ملاقات کہاں ہوئی لیکن مہینہ یا تاریخ یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ پہلی بار جعفری صاحب سے میں اپنے مرحوم دوست یوسف جامی کے ماہنامہ ''شاہراہ'' کے دفتر میں ملا اور یہ بھی یاد ہے کہ یا تو ۱۹۴۷ء کے آخری دن تھے یا ۱۹۴۸ء کے ابتدائی دن۔ صحیح مہینہ یاد نہیں آ رہا ہے۔

اگرچہ ''شاہراہ'' بہت مدت تک جاری نہیں رہا لیکن آج بھی اس کا ہر شمارہ جادۂ اردو ادب پر ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملک کے نامور اہلِ قلم اس کے مدیر رہے۔ اگرچہ اُس وقت اس کے مدیر نامور اہلِ قلم نہیں تھے، ان سے زیادہ نامور اہلِ قلم حضرات کی ایک نسل اُس وقت موجود تھی، مثلاً خواجہ حسن نظامی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، قاضی عبدالغفار، جگر مرادآبادی، تلوک چند محروم، امجد حیدر آبادی، محی الدین قادری زور اور

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

متعدد اور حضرات لیکن ''شاہراہ'' کے جن ایڈیٹروں کی میں بات کر رہا ہوں اُن میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ

بالائے سرش زہوش مندی
محا تا فت ستارۂ بلندی

یہ حضرات تھے وامق جونپوری، ظ۔ انصاری، ساحر لدھیانوی، پرکاش پنڈت، مخمور جالندھری اور سرلا دیوی۔ کسی کسی شمارے پر یوسف جامعی کا نام بھی مدیر کے ساتھ آجایا کرتا تھا۔ میں علی سردار جعفری سے ملاقات کے سلسلے میں جس دور کی بات کر رہا ہوں وہ مندرجہ بالا ایڈیٹروں میں پرکاش پنڈت کا دور ادارت تھا۔ پرکاش پنڈت چونکہ ایک بار ''شاہراہ'' کی ادارت چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کچھ مدت کے بعد دوبارہ آئے اور پھر ''شاہراہ'' کی ادارت اُنھوں نے سنبھالی' اس لیے مہینے یا تاریخ کا تعین اب میرے لیے ممکن نہیں۔ اور تاریخ یا مہینے کا تعین اس تاثراتی مقالے میں ضروری بھی نہیں۔

کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن میں یوسف جامعی اور پرکاش پنڈت سے ملنے ''شاہراہ'' کے دفتر میں گیا۔ اتفاق سے یوسف صاحب دفتر میں موجود تھے نہ پرکاش پنڈت۔ چنانچہ میں ان حضرات کے انتظار میں پرکاش پنڈت کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ سامنے پرکاش پنڈت کی میز پر ''شاہراہ'' کے کتابت شدہ اوراق رکھے تھے۔ میں نے اُن پر نظر ڈالی تو اُوپر اُوپر اقبال کی شاعری پر کسی کا کتابت شدہ مضمون رکھا تھا۔ مجھے اب یاد نہیں کہ یہ مضمون کس کا تھا لیکن یہ دیکھا کہ اُس میں کتابت کی متعدد اغلاط تھیں اور وہ اغلاط کسی نے صحیح بھی کر دی تھیں۔ یعنی اغلاط بھی موجود تھیں اور اُنھیں کاٹ کر صحیح الفاظ، صحیح جملے اور تصحیح شدہ مصرعے بھی موجود تھے۔ میں نے دیکھا کہ کتابت شدہ مضمون میں اقبال کے ہر غلط کتابت شدہ مصرعے کو صحیح کر دیا گیا تھا۔ فارسی کی غلط ترکیبوں کو بھی صحیح کر دیا گیا تھا۔ میں اغلاط کی یہ تصحیح شدہ صورت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور سوچنے لگا کہ دہلی میں آج کل ایسی کون سی شخصیت

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہو سکتی ہے جس کی اقبال کے کلام پر اتنی گہری نظر ہے کہ کتابت کی یا مصنف کی تمام اغلاط کو اُس نے صحیح کر دیا ہے۔

پرکاش پنڈت ''شاہراہ'' کے بہت کامیاب ایڈیٹر تھے۔ ظاہر ہے پروف ریڈنگ وہی کرتے ہوں گے لیکن وہ میرے عزیز دوست تھے اور میں جانتا تھا کہ یہ کام اُن کے بس کا نہیں تھا۔ کلامِ اقبال میں اُن کی اتنی گہری نظر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اُس وقت تک دہلی کے اہلِ قلم حضرات سے میری زیادہ واقفیت بھی نہیں تھی۔ کلامِ اقبال میں گہری نظر رکھنے والے حضرات اُس وقت بھی دہلی میں ہوں گے لیکن میں اُن کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ تھوڑی دیر میں پرکاش پنڈت آ گئے۔ اُن سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے پوچھا کہ اقبال پر اس کتابت شدہ مضمون کی تصحیح کس نے کی ہے۔ اُنھوں نے کہا آپ کو معلوم نہیں سردار جعفری کل سے یہیں ہیں۔ وہ آئے تھے اور میں نے اُنھیں اس کام کی زحمت دی۔ میں یہ سُن کر اُچھل پڑا کہ جعفری دہلی آئے ہوئے ہیں اور فوراً ہی پرکاش سے پوچھا کہ بھئی وہ کہاں ٹھہرے ہیں اور اِس وقت کہاں ہیں۔ پرکاش پنڈت نے اُن کی جائے قیام کے بارے میں بتایا (جو اس وقت مجھے یاد نہیں) لیکن اُن کا یہ بتانا کہ اُن کا کھانا آج جامعہ میں ہے اور وہاں وہ کھانے اور پھر تھوڑی دیر آرام کے بعد یہیں دفتر ''شاہراہ'' میں آئیں گے، میرے لیے یہ اطلاع مژدۂ جانفزا سے کم نہیں تھی۔ میں اُن کے انتظار میں وہیں دفتر ''شاہراہ'' ہی میں رُک گیا۔

اُس وقت تک جعفری کے کلام کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ''پرواز'' اور ''نئی دُنیا کو سلام''۔ ''نئی دُنیا کو سلام'' ایک ڈرامائی نظم ہے۔ اب اس طویل نظم کو پڑھے ایک مدّت ہو گئی ہے۔ یہاں تک مجھے یاد ہے اس نظم میں صرف دو کردار ہیں۔ جاوید اور مریم۔ یہ اپنی طرز کی ایک بے مثال ڈرامائی نظم ہے۔ اصل میں یہ ایک آئینہ ہے جس میں جعفری کے تصوّر کے مستقبل کی کہیں دُھندلی اور کہیں واضح تصویر نظر آتی ہے۔ میں ان

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

دونوں مجموعوں سے دلی طور پر متاثر ہوا تھا۔ اب اس وقت مجھے ٹھیک یاد نہیں آ رہا ہے کہ ''خون کی لکیر'' اُس وقت تک چھپ چکی تھی یا نہیں لیکن جو نظمیں ''خون کی لکیر'' میں شامل ہیں اُن میں سے بعض میں مختلف جرائد میں پڑھ چکا تھا ——— لیکن اس مضمون میں جعفری صاحب کی کتابوں یا شاعری کا ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں چونکہ اُس زمانے میں اُن کی اُسی شاعری سے متاثر تھا جو مذکورہ کتابوں میں یا بعض رسائل میں بہ ذوق وشوق میں نے پڑھی تھیں اس لیے انتقالِ ذہنی اُن کی شاعری کی طرف ہو گیا اور اس طرح کے اشعار میرے احساس میں گونجنے لگے:

وقت کی پلکوں پہ اک آنسو چمکتا ہے مگر
تھرتھرا سکتا ہے عارض پر ٹپک سکتا نہیں

تاجِ انگریزی میں اک ہیرا ہے مثلِ آفتاب
ہند کے بے نور ماتھے پر چمک سکتا نہیں

چپکے چپکے کھل رہا ہے عہدِ نو کا سرخ پھول
مسکرا سکتا ہے زیرِ لب، مہک سکتا نہیں

میں اُس زمانے میں یعنی راولپنڈی اور لاہور کے زمانے میں ادب میں ترقی پسند تحریک کے نام سے آشنا تو ہو چکا تھا لیکن یہ آشنائی صرف جعفری اور فیض کی شاعری سے آشنائی تک محدود تھی۔ جعفری کی شاعری مجھے اقبال اور جوش کی شاعری کا امتزاج نظر آتی تھی۔

میں انھی خیالات میں گم تھا کہ جعفری صاحب آ پہنچے۔ پرکاش پنڈت نے رسمی تعارف کرایا۔ جعفری نے کہا میں آپ کے نام سے واقف ہوں۔ میں نے کہا میں آپ کے نام اور کلام دونوں سے واقف ہوں ——— آپ کی دو ایک تصانیف سے بھی۔ اُنھوں نے میرے والدِ محترم کی خیریت پوچھی اور ایک عجیب دلفریب بات کہی جو آج تک کسی اور نے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نہیں کہی تھی۔ کہنے لگے ہم لوگ جو میر، غالب اور اقبال کی شاعری تک پہنچے ہیں حقیقتاً انھیں رستوں سے ہو کر پہنچے ہیں جو اسمٰعیل میرٹھی، محروم اور بچوں اور طالب علموں کے لیے نظمیں کہنے والے دُوسرے شعراء نے بنائے تھے۔ اگر اِن شعراء کی نظمیں ہماری طالب علمی کے زمانے میں ہمارے اندر ذوقِ شعر پیدا نہ کرتیں تو ہم براہِ راست میر، غالب، ذوق، مومن، اقبال، دُرگا سہائے سرور اور نادر کاکوروی کی شاعری تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ مجھے یہ جملہ سن کر دلی مسرّت ہوئی۔

یہ سردار جعفری سے میری پہلی ملاقات تھی اور مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ایک خزانہ پالیا ہے۔

سردار نے پرکاش پنڈت سے کہا کہ اقبال پر جو کتابت شدہ مضمون تم نے مجھے دکھایا اُس کی تصحیح میں نے کر دی ہے۔ اب یہ دیکھنا تمہارا کام ہے کہ کاتب طباعت سے پہلے تمام اغلاط کی تصحیح کر دے ورنہ میری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ پرکاش پنڈت نے سردار کو بتایا کہ آزاد کو آپ کے دہلی آنے کی اطلاع نہیں تھی۔ یہ تو مجھ سے ملنے آئے تھے۔ جس مضمون کا آپ ذکر کر رہے ہیں اُسے آزاد نے اصلاح شدہ صورت میں دیکھا اور حیرت میں آ کر مجھ سے کہا کہ یہ اصلاح کسی ایسے شخص نے کی ہے جسے کلامِ اقبال میں گہری نظر حاصل ہے۔ میں نے جب یہ بتایا کہ سردار جعفری نے یہ زحمت میری گزارش پر کی ہے تو یہ جان کر آزاد بہت خوش ہوئے کہ آپ دہلی میں ہیں اور تھوڑی دیر میں جامعہ سے واپس یہیں آنے والے ہیں۔ اِس پر میں نے پوچھا کہ آپ کا پروگرام کیا ہے۔ کہنے لگے کہ میں آج رات کی ریل سے ممبئی واپس جا رہا ہوں۔ سُلطانہ میرے ساتھ ہیں۔ اب اِس وقت میں اپنی قیام گاہ پر جا رہا ہوں۔ وہاں میں اور سلطانہ سفر کی تیاری کریں گے اور رات کو فلاں وقت تک ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اَب انشاءاللہ ریلوے اسٹیشن ہی پر مُلاقات ہوگی۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ چنانچہ وہ اپنی قیام گاہ کو روانہ ہوئے اور میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اپنے گھر کو جو روزنامہ ''تیج'' دہلی کے مالک اور ایڈیٹر لالہ دیش بندھو گپتا نے ہمیں موری گیٹ میں دے رکھا تھا۔

(اُس وقت ریلوے اسٹیشن سے مُراد پرانی دہلی کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ نئی دہلی کا ریلوے اسٹیشن تھا تو سہی لیکن آج کے اسٹیشن کا سوواں حصہ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی بہت ہی خوبصورت عمارت تھی۔ ۱۹۴۷ء تک وہ اسٹیشن صرف وائسرائے یا گورنر جنرل کی اسپیشل ریل ہی کے لئے مخصوص تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اچھی خاصی پلاننگ اور لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے خرچ ہونے کے بعد اس اسٹیشن نے وہ صورت اختیار کی جو اس وقت ہمارے سامنے ہے)

تو رات کو میں طے شدہ وقت پر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ اُس رات جعفری صاحب کی ٹرین لیٹ تھی اس لیے آپس میں باتیں کرنے کا اچھا خاصا موقع ملا۔ اُن کی بیگم سلطانہ بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ اُس وقت تک بیگم جعفری کو سلطانہ بھابی کہنے کی نوبت ابھی نہیں آئی تھی۔

سردار نے مُجھ سے پوچھا کہ آپ بمبئی تو آچکے ہوں گے۔ میں نے منفی میں جواب دیا تو بولے ''حیرت ہے۔'' میں نے بمبئی کے بارے میں اپنی لاعلمی کی بنا پر کہا کہ بمبئی آنے کے باوجود بھی سمندر تو دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ بولے ''کیوں نہیں؟'' میں نے کہا میں کلکتے گیا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ سمندر بہت دُور ہے۔ وہاں تک جانے کے لیے بہت اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ کہنے لگے کلکتے جا کے بھی سمندر تک جانا کوئی ایسا مشکل نہیں لیکن بمبئی جانے کے لیے تو آپ کی ریل سمندر کے اُوپر بنے ہوئے پُل سے گزرے گی۔ مُجھے حیرت تو بہت ہوئی لیکن میں نے حیرت کا اظہار نہیں کیا تا کہ لاعلمی پر پردہ پڑا رہے۔ سردار نے اسی مُلاقات میں کہا کہ ہم آپ کو بمبئی بلائیں گے۔ اور جعفری نے یہ وعدہ جلد ہی ایفاء کیا۔ مزید باتیں بھی ہوئیں۔ اب ہر بات یاد بھی نہیں اور اگر یاد آئے بھی تو زیرِ تحریر مضمون تو مضمون یا مقالہ ہے کوئی کتاب تو ہے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نہیں۔ تھوڑی دیر میں ریل آئی۔ جعفری، سلطانہ بھابی اور ایک بچی جو اُن کے ساتھ تھی ریل میں سوار ہو گئے اور میں اس ملاقات سے شاد اور بامُراد ہو کر گھر واپس لوٹا۔

☆

اس کے بعد جعفری کے ساتھ ادھر اُدھر دو ایک ملاقاتیں رہیں۔ جعفری ایک پختہ شعور رکھنے والے مارکسسٹ تھے۔ میں اُس ماحول میں ایک نو وارد تھا۔ اُن کی تینوں شعری کتابیں ارتقائے شعور کا ایک آئینہ تھیں۔ میری شاعری میں اُس ترقی پسندی اور اُس اشتراکیت کی ایک جھلک تو تھی جو ''بیکراں'' کے آخری حصّے میں اور زیادہ مکمل صورت میں ''ستاروں سے ذرّوں تک'' میں نظر آتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی میری شاعری غمِ جاناں کے علاوہ

میانوالی کے صحرا تیرے دیوانوں پہ کیا گزری

(ایک قطعے کا آخری مصرع)

یا

کہاں ہو کارواں والو کہاں ہو | تلاشِ کارواں ہے اور میں ہوں

یا

رشتہ یہ وفا کا تھا نہ توڑا میں نے | منہ تیری محبت سے نہ موڑا میں نے

تُو نے تو مجھے بہت پرے بھیج دیا | لیکن دامن ترا نہ چھوڑا میں نے

(رباعی بعنوان ''لاہور'')

تک ہی محدود رہی۔ اُنھی دِنوں میں نے اپنے کسی مضمون میں حفیظ جالندھری کو فیض سے بہتر شاعر قرار دیا تھا۔ یہ مضمون علی سردار جعفری کی نظر سے گزرا تھا۔ اس کی اشاعت کے چند روز بعد غالبًا کامٹی کے ایک مشاعرے میں سردار جعفری سے ملاقات ہوئی۔ اُس میں باہر سے صرف تین شعراء مدعو کیے گئے تھے۔ سردار جعفری، معین احسن جذبی اور راقم الحروف۔ سردار کے علاوہ مذکورہ مضمون جذبی بھی پڑھ چکے تھے۔ اُن دونوں نے مجھے وہاں آڑے ہاتھوں لیا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اور کہا کہ تم سے اُمید نہیں تھی کہ تم حفیظ کی شاعری کو فیض کی شاعری پر ترجیح دو گے۔ میں نے کہا فیض کے یہاں زبان و بیان کی اغلاط بہت ہیں۔ سردار نے مجھے بہت نرمی سے بات سمجھانا شروع کی لیکن جذبی کو میری یہ تحریر غالباً خاصی ناگوار گزری۔ اُنھوں نے کسی قدر غصّے میں آ کر کہا "آزاد تم نے یہ کیا حفیظ حفیظ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ تم خود حفیظ سے کہیں زیادہ اچھے شعر کہتے ہو۔" ——— اور یہ بات چونکہ جذبی نے نارمل لہجے میں نہیں کہی تھی اس لیے بات یہیں ختم ہو گئی۔

☆

اس وقت مجھے متعدد ملاقاتیں اور متعدد باتیں یاد آ رہی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر میں اسی طرح لکھتا چلا گیا تو یا تو یہ ہوگا کہ "ہماری زبان" کا علی سردار جعفری نمبر چھپ جائے گا اور یہ مضمون اس میں شامل ہونے سے رہ جائے گا اور یا پھر "ہماری زبان" کے علی سردار نمبر کے چھپنے میں تاخیر ہو جائے گی[1] اور یہ دونوں باتیں مناسب نہیں ہیں اس لیے دو ایک واقعات اور بیان کر کے میں اس مضمون کو ختم کر دوں گا۔

مدّت ہوئی بمبئی کے ایک مشاعرے میں جوش صاحب بھی مدعو تھے اور یہ خاکسار بھی۔ منتظمین نے دونوں کے قیام کا انتظام الگ الگ ہوٹلوں میں کیا تھا۔ بمبئی میں اگرچہ شراب پر پابندی تھی لیکن منتظمین میں سے ایک صاحب جوش صاحب کو وہسکی کی ایک بوتل دے گئے تھے۔ میرا طریقہ اُس زمانے میں یہ تھا کہ میں اپنی شراب سفر میں اپنے ساتھ لے کے چلتا تھا۔ جوش صاحب نے جعفری کو اور مجھے اُس رات اپنے ہوٹل میں جام و طعام کی دعوت دی۔ ظاہر ہے کہ طعام کا خرچ تو منتظمین ہی دیتے اور جوش صاحب کے لیے جام کا انتظام منتظمین نے پہلے ہی سے کر دیا تھا۔ عین وقت پر جعفری آئے اور مجھے اپنے ساتھ جوش صاحب کے ہوٹل میں لے گئے۔ جوش صاحب ہم دونوں کے منتظر تھے۔ ابھی جوش صاحب

---

[1] ہوا بھی یہی۔ "ہماری زبان" کا علی سردار جعفری نمبر شائع ہو گیا اور یہ مضمون دہلی تک نہ پہنچ سکا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نے بوتل کھولی ہی نہیں تھی کہ بمبئی کے دو اور شاعر تشریف لے آئے جو میرے بھی عزیز دوست تھے اور جعفری صاحب کے بھی۔ اب ایک بوتل چار شعراء کے لیے تو کافی ہو سکتی تھی لیکن پانچ کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی۔ اتنے میں بیرا آیا تو جوش صاحب نے تین گلاسوں کا آرڈر دیا۔ تین گلاسوں کا آرڈر سُن کر جعفری صاحب نے میری طرف اور میں نے جعفری صاحب کی طرف دیکھا۔ جوش صاحب بھانپ گئے اور بولے ''کسی کا بھلا نہیں ہوگا'' جعفری بھی سمجھ گئے اور میں بھی لیکن اب مزید شراب کے لیے کیا کیا جائے۔ بمبئی میں امتناعِ شراب کا دور تھا۔ جعفری نے قدرے میری طرف جھک کے میرے کان میں کہا اب اس وقت بمبئی میں تو شراب ملے گی نہیں لیکن تم تو سفر میں شراب لے کے چلتے ہو۔ میں نے کہا اب بھی وہسکی میں لے کے آیا ہوں لیکن وہ میرے سوٹ کیس میں ہے اور سوٹ کیس میرے ہوٹل میں ہے۔ جوش صاحب نے کہا آپ دونوں کس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ جعفری نے کہا آپ کے خلاف۔ جوش صاحب نے وضاحت چاہی اور جعفری نے کہا کیا آپ ڈرنک شروع کرنے کا انتظار پندرہ منٹ تک کر سکتے ہیں۔ جوش صاحب سب کچھ دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے۔ بھانپ گئے کہ چونکہ پانچ کے لیے وہسکی کافی نہیں ہے جعفری وہسکی کا انتظام کر رہے ہیں۔ جوش صاحب نے ایک مصنوعی قسم کا مفکرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''ہاں لیکن سولہ منٹ نہ ہونے پائیں۔'' جعفری نے کہا ''ہم پندرہ منٹ سے پہلے ہی واپس آ جائیں گے۔'' اُٹھتے ہوئے میرے مُنہ سے نکلا ''اِنشاءاللہ۔'' جوش نے کہا ''لو مسلمان نے اِنشاءاللہ کہا ہے۔ اب یہ پندرہ منٹ میں واپس نہیں آئیں گے۔'' جعفری نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا ''اب تم کلمہ پڑھ لو'' یہ کہہ کے ہم باہر نکلے ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل سے وہسکی کی بوتل لے کر پندرہ منٹ سے پہلے ہی جوش صاحب کے ہوٹل میں واپس آ گئے۔ میرا ہوٹل جوش صاحب کے ہوٹل سے دُور نہیں تھا لیکن بمبئی ایسے شہر میں بغیر کسی رہنما کے وہاں پہنچنا مشکل

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تھا۔ واپس پہنچ کے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دام دینا چاہے تو جعفری نے مجھے روک دیا اور میرے اصرار کے باوجود انھوں نے اپنی گرہ سے دام دیے۔ یہ میں نے دیکھا کہ ایسے موقعوں پر جعفری اکثر آگے بڑھ کے دوسروں کے دام ادا کر دیا کرتے تھے۔

چونکہ ہم سب کو مشاعرے میں جانا تھا اس لیے جام وطعام کے ختم ہوتے ہی منتظمین حضرات آئے اور ہمیں مشاعرہ گاہ میں لے گئے۔

دوسری صبح جعفری کا ٹیلی فون آیا کہ آج دن کا کھانا ہم اکٹھے گھر ہی میں کھائیں گے۔ تمھارے لیے وہسکی کی بوتل میں نے لے رکھی ہے۔ میں نے کہا دن کے کھانے کے ساتھ وہسکی کا کیا تعلق۔ کہنے لگے رات کی بوتل کے بدلے میں۔ مجھے یہ بات ناگوار گزری۔ میں نے کہا جعفری صاحب اگر آپ رات کی وہسکی کے بدلے میں وہسکی کی بوتل دینا چاہیں گے تو میں آپ کے یہاں کھانا کھانے نہیں آؤں گا۔ اور یہ تلذذ بہت دن تک میرے دل میں موجود رہے گا۔ دوستی دوستی ہے، لیجر بازی نہیں ہے۔ جعفری نے ہنستے ہوئے کہا یہ لیجر بازی کا لفظ تم نے خوب استعمال کیا ہے۔ کھانے کے لیے تو میں خود آ کر تمھیں لے جاؤں گا اور بوتل والی بات ختم۔ چنانچہ دوسری صبح جعفری آئے اور خود مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ اب میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ

ع - ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

لاہور کے ایک سفر میں ہم اکٹھے تھے۔ وجہ سفر اقبال انٹرنیشنل کانفرنس میں ہم دونوں کی شرکت تھی۔ قیام ہمارا ایک ہی ہوٹل میں تھا۔ کمرے الگ الگ تھے لیکن چوبیس گھنٹوں میں سولہ سترہ گھنٹے ہم اکٹھے ہی رہتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ فیض صاحب نے بھی کھانا وہیں کھایا تھا۔ لنچ کے بعد کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ تھا۔ ہوٹل ہی کے ایک خالی کمرے میں محفل جم گئی۔ میرے استاد محترم صوفی غلام مصطفےٰ تبسم بھی آ گئے۔ فیض صاحب نے صوفی صاحب سے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

خطاب کرتے ہوئے کہا صوفی صاحب' جعفری اور آزاد کو ہم ہر وقت اکٹھا ہی دیکھتے ہیں۔ یہ دونوں اقبال کے عاشق ہیں۔ مقام حیرت ہے کہ ان کی آپس میں رقابت نہیں اور دوستی ہے۔ یہ عجیب معاملہ ہے۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ اس کا جواب تو انھیں میں سے کسی کو دینا چاہیے۔ انھوں نے سردار سے خطاب کرتے ہوئے کہا جعفری صاحب' فیض صاحب کے سوال کا جواب دیجیے۔ جعفری صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ شاید یہ سوچ رہے ہوں کہ دوستی کی ابتداء کب ہوئی یا کس کی طرف سے ہوئی یا کیسے ہوئی یا خدا جانے کیا سوچ رہے ہوں کہ صوفی صاحب نے اچانک مجھ سے کہا کہ "جگن ناتھ تم بتاؤ تم دونوں میں دوستی کیوں ہے رقابت کیوں نہیں؟" میں نے کہا قبلہ' ہم جس محبوب شخصیت کی یاد میں یہ عظیم الشان جلسہ یا کانفرنس منعقد کر رہے وہ محبوب شخصیت اس سوال کا جواب پہلے ہی دے چکی ہے۔ فیض صاحب نے پوچھا وہ کیسے؟ میں نے کہا علامہ فرماتے ہیں ؎

محبت چوں تمام اُفتد رقابت از میاں خیزد
بہ طوفِ شعلہ ء پروانہ با پروانہ می سازد

فیض یہ جواب سُن کر اُچھل پڑے۔ کہنے لگے اس سے بہتر جواب اور ہو ہی نہیں سکتا۔ صوفی صاحب نے مجھے تھپکی دی اور جعفری صاحب نے فیض صاحب سے خطاب کرتے ہوئے کہا فیض صاحب آپ حیرت کا اظہار کیوں کر رہے ہیں؟ یہ شاگرد کس کا ہے؟ فیض نے فوراً کہا شاگرد تو یہ صوفی صاحب کا ہے یہ میں جانتا ہوں اور بیٹا محروم صاحب کا ہے۔ اس سوال کا جواب اقبال کے شعر میں ہی پیش کر سکتا تھا۔ اُس وقت صوفی صاحب کے چہرے پر جو مسرت نمایاں تھی اُسے میرے لیے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ صوفی صاحب، فیض صاحب اور جعفری صاحب کی مسرت دیکھ کر مُجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مُجھے کائنات مل گئی ہو۔ (کیا دور تھا اور کیا لوگ تھے۔ اُستاد اور شاگرد کا رشتہ باپ بیٹے کا رشتہ ہوتا تھا۔ اُستاد کی محبت پدری محبت سے، شفقت پدری شفقت سے اور غصہ پدری غصے سے کم نہیں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہوتا تھا۔ اس وقت جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں میری آنکھوں کے سامنے لاہور کی یہ محفل جمی ہوئی ہے اور میں اس کی یاد میں آنسو بہا رہا ہوں۔ صوفی صاحب اور فیض صاحب تو بہت پہلے جا چکے تھے۔ اب تازہ ترین صدمہ جعفری کے جانے کا ہے جس نے کئی پرانے صدمات تازہ کر دیے ہیں)

اس وقت حیدر آباد (سندھ) کا ایک سفر یاد آ رہا ہے۔

حیدر آباد سندھ کے مشاعرے میں جعفری صاحب بھی مدعو تھے اور راقم التحریر بھی۔ کراچی تک تو سفر الگ الگ تھا کیونکہ وہ بمبئی سے روانہ ہوئے تھے اور میں دہلی سے لیکن کراچی کے ہر مشاعرے میں ملاقات ہوتی تھی۔ یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مشاعرے کی ملاقات کوئی ملاقات نہیں ہوتی۔ مشاعرے سے قبل ڈنر کے وقت آپس میں جو باتیں ہو جائیں وہ ہو جائیں لیکن مشاعرہ شروع ہو جائے تو پھر باتیں کرنے کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر شعراء مشاعرے میں باتیں کریں تو سامعین کو تو ناگوار گزرتا ہی ہے بعض شعراء بھی اسے برا سمجھتے ہیں اور میں خود انھی شعراء میں ہوں جو مشاعرے میں باتیں کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ لیکن کراچی میں متعدد روز کے قیام کے باوجود جو کمی رہ گئی وہ حیدر آباد سندھ کے مشاعرے میں کسی حد تک پوری ہو گئی۔

حیدر آباد میں قیام کے لیے جعفری کو اور مجھے ایک ہی کمرہ ملا۔ ہم دونوں اس میں مقیم تھے۔ ابھی رات کے کھانے کا وقت بھی نہیں ہوا تھا میں اور جعفری صاحب آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور حبیب جالب اندر داخل ہوئے۔ غالباً حبیب جالب اور جعفری صاحب کی اُس وقت تک ملاقات کہیں نہیں ہوئی تھی اس لیے جعفری صاحب نے انھیں نہ پہچانا۔ میری اور جالب صاحب کی ملاقاتیں لائل پور کاٹن ملز کے مشاعروں میں ہو چکی تھیں۔ پہلی ملاقات تو یوں ہوئی کہ میں اور غلام ربانی تاباں لائل پور کا مشاعرہ پڑھ کے لاہور پہنچے تو

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میرے ایک عزیز دوست، مداح اور قدر دان خلیفہ اقبال حسین کے دولت کدے پر ہم نے قیام کیا۔ اقبال حسین کا مکان اُردو بازار سے چار قدم کے فاصلے پر تھا۔ اقبال حسین کے گھر جب ہم پہنچے تو شام ہونے کو تھی۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو میں نے تاباں سے کہا کہ ''نقوش'' کا دفتر یعنی ادارۂ فروغِ اُردو یہاں سے بہت نزدیک ہے۔ کیوں نہ ہم دونوں محمد طفیل مدیر ''نقوش'' سے مل آئیں۔ تاباں نے ہامی بھری۔ ہم ابھی طفیل صاحب کے دفتر میں جا کے بیٹھے ہی تھے کہ حبیب جالب میری اور تاباں صاحب کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے۔ میرے علاوہ تاباں کے ساتھ بھی اُن کا تعارف پہلے سے تھا کیونکہ وہ چیمسفورڈ کلب کے مشاعرے میں دو ایک بار آ چکے تھے۔ جالب ہم دونوں سے صرف ملنے ہی نہیں آئے تھے بلکہ اپنے مجموعہ کلام کی دو جلدیں بھی ہمارے لیے ساتھ لائے تھے۔ ایک اُنھوں نے مجھے عنایت کی اور ایک تاباں صاحب کو دی۔

معذرت خواہ ہوں کہ میں نے صرف یہ بتانے کے لیے کہ حبیب جالب سے میری مُلاقات پہلے سے ہو چکی تھی اتنی طویل کہانی سنا دی ——— تو میں کہہ رہا تھا کہ جعفری صاحب اور حبیب جالب صاحب کا ابھی تک آپس میں تعارف نہیں ہوا تھا۔ (غائبانہ تعارف تو کئی بار ہو چکا ہوگا) دونوں یوں بھی ہم مشرب تھے کہ دونوں کی زندگی کا خاصہ حصّہ جیل خانوں میں گزر رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ حبیب جالب پاکستان کے جیل خانوں کی آبرو بڑھا رہے تھے اور سردار جعفری ہندوستان کے جیل خانوں کی عزت اور احترام میں اضافہ کر رہے تھے۔

میں نے اُن دونوں کا تعارف کرایا تو دونوں ایک دُوسرے سے لپٹ گئے۔ اب باتوں میں ہم تینوں شریک تھے۔ جعفری صاحب نے جالب صاحب سے پوچھا آپ کس کمرے میں ہیں؟ کمرے کا نمبر کیا ہے؟'' میں نے کہا ان کے کمرے کا نمبر دس ہے۔ جالب نے کہا یار دس ہوتا تو لینے میں کیا اعتراض تھا۔ مشکل یہ ہے کہ یہاں کوئی کمرہ خالی ہی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نہیں ہے۔ منتظمین کہہ رہے ہیں ابھی کہیں انتظام کرتے ہیں۔ جعفری نے میری طرف دیکھا اور میں نے جعفری کی طرف۔ دونوں ایک دوسرے کا مفہوم سمجھ گئے۔ میں نے کہا جالب، دیکھو، یہاں دو پلنگ ہیں۔ ایک تم لے لو ایک جعفری۔ مجھے ورٹیگو (Vertigo) کی تکلیف ہے اور میرے لیے گدے دار پلنگ پر سونا منع ہے۔ ڈاکٹر نے hard bed پر سونے کی ہدایت دے رکھی ہے۔ جعفری نے حیرت زدہ ہو کے پوچھا تمہیں بھی (vertigo) کی تکلیف ہے۔ میں نے کہا تکلیف تو ایک مدت سے ہے لیکن چونکہ احتیاط سے کام لیتا ہوں بالخصوص سفر میں تو اسے روک رکھا ہے۔ میں نے جعفری کو یاد دلایا کہ ایک بار جب میں بمبئی میں تمہارے یہاں مقیم تھا تو ایک روز صبح کو جاگتے ہی مجھے چکر آنا شروع ہو گئے تھے۔ اور میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے dramamin کا ایک پتا منگوا دو۔ میرا علاج یہی ہے لیکن تم اصرار کر کے مجھے اس ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے جس کا کلینک تمہارے گھر کے قریب بومن جی پٹ روڈ کے سرے پر ہے ——— لیکن یہ جو تم نے پوچھا ہے کہ کیا تمہیں بھی (vertigo) کی تکلیف ہے تو اس جملے میں ''بھی'' سے کیا مراد ہے۔ جعفری نے کہا کہ میں بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں۔ میں نے اور جالب نے یہی سمجھا کہ یہ نہیں چاہتے کہ میں یا جالب فرش پر بستر لگائیں اور یہ پلنگ پر سوئیں۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ جعفری صاحب دیکھئے جالب اس وقت ہم دونوں کے مہمان ہیں ان کا فرش پر سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا یہ پلنگ ان کا ہے۔ دوسرا آپ کا ہے۔ آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ ہم دونوں میں ہزار بے تکلفی سہی لیکن میں یہ بالکل گوارا نہیں کر سکتا کہ میں پلنگ پر سوؤں اور آپ فرش پر۔ لیکن جعفری اپنی ضد پر قائم رہے۔ جالب نے دخل دیتے ہوئے کہا کہ ''آپ دونوں تو اس کمرے میں پہلے سے ہیں۔ میں تو مخل ہوا ہوں اس لیے میں فرش پر سوؤں گا۔'' میں نے کہا ''یار تم مزید complication پیدا نہ کرو۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ یہ جھگڑا مجھ میں اور جعفری صاحب میں ہے۔ لیکن نتیجہ اس ساری بحث کا یہ تھا کہ جعفری صاحب

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہی کامیاب ہوئے اور وہ فرش پر سوئے اور حبیب جالب اور میں اپنے اپنے پلنگ پر۔ یہ جعفری کی عظمت تھی اور اُن کی عظمت کا اعتراف ہم اُن کے جونیئر دوست اور جونیئر شاعر اور ادیب اُن کی زندگی میں بھی کرتے تھے اور آج اُن کے انتقال کے بعد بھی کرتے ہیں۔ وہ مجسمہ عظمت و شرافت تھے:

ع - خدا کی رحمتوں کا نور برسے مرنے والے پر!

میں نے جالب صاحب سے کہا کہ آپ کا سامان کہاں ہے۔ کہنے لگے وہ چوکیدار کی تحویل میں ہے۔ میں نے کہا چلئے ہم دونوں جا کے آپ کا سامان لے آتے ہیں۔ اُن کا سوٹ کیس ہم نے لا کے کمرے میں رکھا تو کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد شعراء کا قافلہ منتظمین کی رہنمائی میں مشاعرہ گاہ کو چلا۔ مشاعرے کی صدارت کا اعزاز علی سردار جعفری کو دیا گیا۔ یہ اُس محبت کا ایک عملی اظہار تھا جو علی سردار جعفری کے فکر و فن کے لیے اور ہندوستان کے شعراء کے لیے اہل پاکستان کے دلوں میں موجود تھا اور ہے۔ معلوم نہیں دونوں ملکوں ہندوستان اور پاکستان کے سیاست دان یا صحیح لفظوں میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اس نکتے کو کب سمجھیں گی۔

مشاعرہ ہر اعتبار سے کامیاب تھا۔ اس کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ مشاعرہ باغیانہ جھلک دے رہا تھا۔ حمایت علی شاعر کی ایک غزل کا لب و لہجہ خاصہ باغیانہ تھا۔ "ایک غزل" سے میری مُراد ہے کہ اُن کا کلام بعض اور شعراء کی طرح جن میں سردار جعفری، حبیب جالب اور یہ خاکسار شامل تھے بار بار سُنا گیا۔ غالباً حمایت علی شاعر کی غزل کی ردیف یہ تھی "غور سے سنو" کوئی مصرع مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ حبیب جالب کے مصرعوں میں کچھ جتنے اس طرح کے تھے:

..... ظلمت کو ضیاء کیا کہنا؟

..... بادل کو ردا کیا کہنا؟

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اور میں نے یہ دیکھا کہ باغیانہ انداز کے جتنے اشعار یا مصرعے پڑھے جا رہے ہیں جعفری صاحب ایک کاغذ پر وہ سب لکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ باغیانہ شاعری اُن کے مزاج کے عین مطابق تھی۔

ہم لوگ جس وقت مشاعرہ گاہ میں داخل ہو رہے تھے تو سامنے ایک بورڈ پر جس پر بین المملکتی مشاعرہ وغیرہ کے الفاظ لکھے تھے وہاں 'بہ یاد اقبال' بھی لکھا تھا۔ چنانچہ راقم التحریر نے علامہ اقبال ہی کے بارے میں اپنی نظم سے ابتداء کی۔ بعد میں اس طرح کی غزلوں کی فرمائش ہوئی۔

کیا خبر کیا بات اُس کے کفر میں پوشیدہ تھی
ایک کافر کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت

غالباً 'بہ یاد اقبال' کے الفاظ پر کسی شاعر کی نظر نہیں پڑی یا علامہ اقبال کے متعلق کسی شاعر نے نظم نہیں پڑھی کہ مشاعرہ جنوبی پاکستان میں منعقد ہو رہا تھا ——— لیکن خیر میں نے محسوس کیا تھا کہ جو مشاعرہ بیاد اقبال منعقد ہو رہا ہے اُس میں مجھے اقبال کے بارے میں نظم ضرور پڑھنا چاہئے۔ جعفری صاحب تو صدر تھے۔ انھیں تو آخر میں پڑھنا ہی تھا۔ اُن سے پہلے میری باری تھی تو گویا آخر تک جب میں نے دیکھا کہ علامہ اقبال کے متعلق کسی شاعر نے اپنا کلام پیش نہیں کیا تو میں نے یہ فرض ادا کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے دو ایک دن کے بعد کراچی میں روزنامہ ''جسارت'' کا ادبی ایڈیشن دیکھنے کا جو مجھے اتفاق ہوا تو اس میں منصور احمد سلیم کی مندرجہ ذیل نظم دیکھنے کو ملی:

''بنام جگن ناتھ آزاد''
بہ سلسلہ بیاد اقبال جناب علی سردار جعفری کی زیر صدارت
حیدرآباد سندھ میں ۲۲ر اپریل کو منعقدہ مشاعرے کا ایک تاثر

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کل مرے شہر کی گلیوں میں تھی جس بزم کی دھوم
ہوگئی ختم سُنا کر غمِ دل کی رُوداد

آؤ جس بزم کا عنواں ہو "بیادِ اقبال"
نام اقبال کا آئے نہ وہاں بھول کے یاد

اِک ترے حُسنِ عقیدت نے کیے پھول نثار
اک تری ذات نے بس اُس کو کہا "زندہ باد"

آئینہ تُو نے دکھایا ہمیں حق گوئی کا
کون ہے دے جو تیری جُرأتِ بیباک کی داد

کون اب کفر شکن کو بھلا کافر لکھے
شکریہ تیرا تہِ دل سے جگن ناتھ آزاد

ہوسکتا ہے کوئی صاحب یہ سمجھیں کہ یہ چند اشعار نقل کرکے میں نے اپنی توصیف کا پہلو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقتاً جس جذبے نے مجھے یہ اشعار نقل کرنے پر مجبور کیا ہے وہ یہ ہے کہ منصور احمد صاحب سلیم سے میری واقفیت نہ اُس وقت تھی نہ اب ہے۔ مجھے اُن کا پتا بھی معلوم نہیں۔ کئی بار خیال آیا کہ اُن کا پتا معلوم ہو تو میں اُنھیں شکریے کا خط لکھوں۔ کراچی جانے کا اتفاق بھی کئی بار ہوا لیکن سلیم صاحب سے مُلاقات کا اتفاق نہ ہوا۔ سوچا یہ اشعار اپنے شکریے کے ساتھ اِسی مقالے میں شامل کردوں، ہوسکتا ہے کہ میرا شکریہ اسی طرح سے اُن تک پہنچ جائے۔

☆

لیجیے، میں متحدہ عرب امارات کا ایک اہم سفر تو بھول ہی گیا۔ یہ اہم اس لیے تھا کہ یہ عزیزِ محترم سلیم جعفری مرحوم کے زیرِ اہتمام پہلا ہند پاک مشاعرہ تھا۔ اُس وقت تک

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نامی ادارہ معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ Unikarians International UAE Chapter

Unikarians کا لفظ University of Karachi Old Boys Association کا مخفف ہے۔ یہ میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ سلیم جعفری کے ہند و پاک مشاعروں کا سلسلہ دبئی، ابوظہبی، شارجہ اور العین میں اوّل اوّل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے شروع ہوا تھا۔ اور مذکورہ پہلا مشاعرہ فیض صاحب کی یاد میں تھا۔

اس مشاعرے کے لیے جن حضرات نے مالی امداد دی تھی اُن میں اکثر علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ بھی تھے۔ اُن میں سے بعض نے اِس بات پر اعتراض کیا کہ جب فیض صاحب کا علی گڑھ سے کوئی تعلق ہی نہیں تو یہ مشاعرہ اُن کی یاد میں کیوں منعقد کیا جا رہا ہے۔ علی گڑھ ہی کے کسی شاعر مثلاً مجاز کی یاد میں کیوں نہ منعقد کیا جائے۔ اعتراض کرنے والے حضرات نے تعاون تو آخر تک کیا لیکن اُن کا اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہا۔ اس مشاعرے کی صدارت کا اعزاز سلیم جعفری نے علی سردار جعفری کو دیا تھا۔ مجھے اب مکمل طور پر یہ تو یاد نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان سے کون کون سے شعراء اس مشاعرے میں شریک تھے لیکن اتنا یاد ہے کہ راقم الحروف کے علاوہ حمایت علی شاعر اور ملک زادہ منظور اس میں شریک تھے۔ غالباً قتیل شفائی اور پیرزادہ قاسم بھی تھے اور احمد فراز بھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے تھوڑی دیر قبل تک سلیم جعفری کو یہ اندیشہ رہا کہ ممکن ہے معترضین میں سے بعض حضرات مشاعرے میں گڑبڑ کریں۔ اس خیال کے پیشِ نظر ڈنر کے ختم ہوتے ہی سلیم جعفری صاحب مجھے اور علی سردار جعفری کو ایک طرف لے گئے اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے کہا کہ اس معاملے میں علی سردار مناسب رائے دے سکتے ہیں کیونکہ یہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے طالب علم رہے ہیں۔ میں تو نہ علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم رہا ہوں اور نہ ہی کراچی یونیورسٹی کا اس لیے ان یونیورسٹیوں کے مزاج سے واقف نہیں ہوں۔ میرا رشتہ تو علی گڑھ یونی ورسٹی کے ساتھ دو ایک سیمیناروں میں شرکت کا ہے اور کراچی یونیورسٹی کے ساتھ دو تو سیمی لیکچروں کا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہاں ایک مشورہ میں دے سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ سردار جعفری اپنا خطبہ ٔصدارت مشاعرے کے آخر میں نہ دیں بلکہ ان کے خطبہ ٔصدارت سے مشاعرے کی ابتداء کی جائے۔ کیونکہ ان کی تقریر بھی جادو کا اثر رکھتی ہے اور ان کے خطبہ ٔصدارت کے بعد مشاعرہ جم جائے گا۔ سلیم جعفری نے کہا لیکن پتا چلے جعفری صاحب کہیں گے کیا۔ اس پر جعفری صاحب نے کہا کہ ''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے'' اس جملے پر مجھے تو سو فی صد اطمینان ہو گیا اور میں نے توکل بہ خدا کر کے سلیم جعفری کو یقین دلایا کہ انشاءاللہ مشاعرے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو گی۔

تھوڑی دیر کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ سلیم جعفری نے علی سردار جعفری کی صدارت کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا استقبال تالیوں سے ہوا۔ علی سردار جعفری نے اپنی تقریر ان جملوں سے شروع کی:

> ''حضرات یہ پاک ہند مشاعرہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے فیض صاحب کی یاد میں منعقد ہو رہا ہے۔ فیض صاحب نے علی گڑھ میں نہیں پڑھا لیکن علی گڑھ نے فیض صاحب کو پڑھا ہے اور بڑی محبت سے پڑھا ہے.....''

ان دو جملوں پر تو اس زور شور سے تالیاں بجیں کہ پہلے والی استقبالیہ تالیاں مات کھا گئیں۔ جعفری صاحب کی یہ صدارتی تقریر بس پندرہ منٹ تک رہی اور ہم سب کو سلیم جعفری سمیت اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ تقریر مشاعرے کی کامیابی کی ضامن ہے اور یہی ہوا کہ مشاعرہ آخر تک بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ اور خاصی حد تک اس کامیابی کا سبب علی سردار جعفری کا خطبہ ٔصدارت تھا۔

☆

زیرِ نظر تحریر میں اپنے اور جعفری صاحب کے ایک سفر لاہور کا میں نے ذکر کیا ہے۔ دہلی سے لاہور تک طیارے کے سفر کی رُوداد بھی سُنانے کے قابل ہے۔ یہ دسمبر ۱۹۷۷ء کی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بات ہے جب پہلی اقبال عالمی کانفرنس لاہور اور سیال کوٹ میں منعقد ہوئی۔

سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰن، سردار جعفری اور راقم التحریر ایک ہی طیارے سے لاہور پہنچے تھے۔ پی آئی اے کا طیارہ تھا۔ صباح الدّین عبدالرحمٰن ہم دونوں سے چند نشستیں آگے کسی قدر فاصلے پر تھے اور میں اور جعفری دونوں ساتھ کی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ اُس زمانے تک ابھی پی آئی اے میں مکمل طور پر شراب ممنوع نہیں ہوئی تھی۔ غیر پاکستانی مسافروں کو یہ مل سکتی تھی۔ جہاز air born ہوا تو سردار جعفری نے گھنٹی کے بٹن پر اُنگلی رکھی۔ ایر ہوسٹ (ایر ہوسٹس نہیں) آیا۔ سردار جعفری نے وہسکی کی فرمائش کی۔ اُس نے پوچھا آپ کا نام۔ (یہ سوال سب انگریزی میں تھے) اُنھوں نے جواب میں کہا علی سردار جعفری۔ وہ ایر ہوسٹ فوراً بولا آپ مسلمان ہیں اور آپ شراب کی فرمائش کر رہے ہیں۔ جعفری صاحب نے کہا لیکن میں پاکستانی نہیں ہوں، اس اعتبار سے غیر ملکی ہوں۔ ایر ہوسٹ نے کہا لیکن آپ ہیں تو مسلمان۔ ہم آپ کو شراب نہیں دے سکیں گے۔ اب جعفری نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اچھا اِن کے لئے لے آیئے'' اُس نے پوچھا ''اِن کا نام؟'' میں خاموش بیٹھا تھا، جعفری صاحب نے کہا ''جگن ناتھ آزاد۔'' ایر ہوسٹ نے میرا نام دہراتے ہوئے کہا ''جگن ناتھ آزاد! اِن کو تو ہم قطعاً شراب مہیا نہیں کر سکیں گے۔'' جعفری صاحب نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔ ''کیوں، کیا بات ہے؟ یہ مسلمان نہیں ہیں۔'' ایر ہوسٹ نے فوراً جواب دیا کہ ہم اِن کو صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ پاکستانی بھی سمجھتے ہیں۔ یہ کہا اور جعفری صاحب کی تعمیل ارشاد کیے بغیر واپس چلا گیا۔ ہم دونوں کو ہنسی آ گئی اور ہم نے اِس فقرے کا خوب لطف اُٹھایا اگرچہ جعفری صاحب کو شراب نہ ملنے پر مجھے قدرے اَفسردگی ہوئی اور ایر ہوسٹ کی بات سُن کے دلی مسرّت ہوئی لیکن میں نے اپنے جذبات کے دونوں پہلوؤں کو چھپایا اور جعفری صاحب کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گیا ——— اور اُن سے میں نے یہ کہا کہ معمولی بات ہے تھوڑی دیر میں ہم لاہور پہنچ جائیں گے۔ وہاں یہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

مسئلہ حل ہو جائے گا۔

کار ساز ما بہ فکر کار ما　　فکرِ ما در کار ما آزار ما

جعفری کو یہ شعر پسند آیا۔ مجھ سے اُنھوں نے پوچھا ''کس کا شعر ہے؟'' میں نے کہا معلوم نہیں، غالباً شیخ سعدی کا ہے۔ کہنے لگے اگر حافظ کا ہوتا تو ہم کہتے کہ ہم نے فال نکال لی ہے۔ میں نے کہا آپ اِسے فال ہی سمجھئے اور ایر ہوسٹ کے اِنکار کو بھول جائیے۔

تھوڑی دیر میں طیارہ لاہور پہنچ گیا۔ میں اور سردار جعفری جب منتظمین کی رہنمائی میں ایر پورٹ سے اِنٹر کانٹی نینٹل ہوٹل پہنچے تو فیض صاحب دروازے پر موجود تھے۔ میں نے کہا آج تو آپ میزبان ہیں اور تمام مندوبین کی پیشوائی کر رہے ہیں۔ ایک سو اسّی مندوبین کا اِستقبال آپ کو کرنا ہوگا۔ کہنے لگے نہیں، میں صرف تمہارے اور سردار جعفری کے اِنتظار میں کھڑا ہوں۔ اب تم دونوں آ گئے ہو تو میرا کام ختم ہو گیا۔ چلو بار میں چلیں۔

میں پاکستان میں عموماً شراب سے اِجتناب کرتا ہوں۔ ایک تو اِس لیے کہ میرے والدِ محترم کو جاننے والے لوگوں کی خاصی تعداد وہاں موجود ہے۔ اُن کی نسل کے لوگ تو اب نہیں ہیں لیکن والد کے شاگرد اور اُن کے شاگردوں کے شاگرد ابھی تک پاکستان میں اپنا تعارف میرے ساتھ اِسی حوالے سے کراتے ہیں۔ دُوسرا سبب یہ ہے کہ پاکستان میں اور بالخصوص لاہور اور راولپنڈی میں میرا حلقۂ احباب اِتنا وسیع ہے کہ اُن سب کے ساتھ ملنے ملانے سے فرصت ہی نہیں ملتی اور شراب فرصت کی چیز ہے اور فرصت تو اب میرے لیے ہندوستان میں بھی عنقا ہو گئی ہے۔ پاکستان میں کیسے مل سکتی ہے۔ میرے بچپن اور لڑکپن کے دوست، ہم درس حضرات، والدِ محترم کے نیاز مند حضرات لاہور پہنچتے ہی اِن سے ملاقاتوں اور ٹیلی فونوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اُس وقت بھی چند احباب ہوٹل میں میرے منتظر تھے اِس لیے میں نے معذرت کر لی اور

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

فیض اور جعفری بار میں چلے گئے۔

یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جب فیض صاحب، سردار اور میں آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ثمینہ پیرزادہ نے (جو اُس وقت انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں گیسٹ ریلیشنز آفیسر تھیں اور بعد میں جنھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے سیریلز میں اپنی فن کاری کے جوہر دکھا کر بڑا نام پایا) ہم تینوں کے پاس آ کے پوچھا کہ کیا آپ میں کوئی صاحب جگن ناتھ آزاد بھی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں میں ہوں۔ تو اُنھوں نے بتایا کہ اسی لاؤنج میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ میرے لیے اپنی چند تصانیف لائے تھے۔ چنانچہ میں فیض صاحب اور جعفری صاحب سے اجازت لے کر اُستادِ محترم سیّد عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُن کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ وہ بھی بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔ اپنی تصانیف جو وہ میرے لیے لائے تھے اُنھوں نے مجھے عنایت کیں۔ اُن کے ساتھ کافی دیر تک باتیں رہیں اور چونکہ میں سفر سے پہنچا تھا اُنھوں نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ میں اب سوچتا ہوں کہ اگر اُستادِ محترم ڈاکٹر سیّد عبداللہ مجھے فیض صاحب اور جعفری صاحب کے ساتھ بار میں جاتے دیکھ لیتے تو اُنھیں کس قدر صدمہ ہوتا۔

اُستادِ محترم ڈاکٹر سیّد عبداللہ سے مل کے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ساڑھے آٹھ بجے نیچے سے ٹیلی فون آیا کہ کھانا میزوں پر لگایا جا رہا ہے۔ تشریف لائیے۔ میں نے سوچا فیض اور جعفری بار میں گئے تھے۔ اگر اس وقت وہیں ہوں تو ان دونوں کو بتا دوں۔ چنانچہ میں نے بار میں ٹیلی فون کیا۔ جعفری صاحب نے جواب میں کہا کہ آپ کو اگر شدید بھوک نہ لگی ہو تو کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔ میں نے کہا اسی لیے تو میں نے ٹیلیفون کیا ہے کہ ڈائننگ ہال سے فون آیا ہے کہ کھانا میز پر لگایا جا رہا ہے۔ اتنے میں جعفری صاحب سے ٹیلی فون فیض صاحب نے لے لیا تھا۔ اب جواب فیض صاحب کی طرف سے آیا کہ تم اور جعفری آج میرے ساتھ کھانا کھاؤ گے لیکن یہاں ہوٹل میں نہیں بلکہ میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

جہاں آپ دونوں کو لے جاؤں گا ——— اور ہم بیس پچیس منٹ تک فارغ ہو کر تمہارے کمرے میں آ رہے ہیں۔

چنانچہ فیض صاحب اور جعفری صاحب تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ جہاں لے گئے وہ متحدہ پنجاب کے سابق وزیرِ اعظم سر سکندر حیات خان مرحوم کے داماد کا دولت کدہ تھا۔ اُن کا اسمِ گرامی مجھے اِس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔ غالباً مظفر صاحب یا مظہر صاحب تھا۔ اُن کی اور اُن کی بیگم صاحبہ کی خاطر و مدارت کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے کم نہ تھی۔ یہاں پھر طعام سے قبل جام و کلام کی محفل جم گئی۔ ابتداء راقم التحریر نے کی، میرے بعد جعفری صاحب نے اپنا کلام سنایا اور آخر میں فیض صاحب نے۔ فیض صاحب کے بعد صاحب خانہ نے جعفری صاحب سے "میرا سفر" سنانے کی فرمائش کی اور اِسی پر یہ محفل اختتام پذیر ہوئی۔

(نامکمل)

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اوما شنکر جوشی

اِک چراغ اور بُجھا اور بڑھی تاریکی

۱۹ر دسمبر کو بمبئی کے ایک ہسپتال میں گجراتی کے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے شاعر، ادیب، دانشور، افسانہ نگار، ناول نگار، انشاء پرداز اور سیاست دان اُوما شنکر جوشی کا اِنتقال ہوگیا۔ یہ خبر انگریزی اخبارات میں میری نظر سے گزری لیکن اُردو اخبارات خاصی حد تک اِس اطلاع سے بے خبر رہے۔ ہاں جب ہمارے نائب صدر (جمہوریہ ہند) نے راجیہ سبھا میں ان کا ماتمی ریزولیوشن پیش کیا تو اُردو اخبارات نے کسی حد تک اِس اطلاع کا نوٹس لیا۔

یہ ہم اہلِ ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ ہم یورپ، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور رُوس کے اکثر صفِ دوم تک کے اہلِ قلم کے نام اور کام سے کسی حد تک واقف ہیں لیکن اپنے ملک کی اکثر زبانوں کے صفِ اوّل کے دانشوروں اور اہلِ قلم کے نام اور کام سے آشنا نہیں ہیں۔ اوما شنکر جوشی کے نام سے ہم اُردو والوں کی واقفیت بھی بڑی حد تک اِسی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ذیل میں آتی ہے۔

اوما شنکر جوشی نے ۷۸ برس کی عمر میں انتقال کیا اور اپنی زندگی میں اُنھوں نے گجراتی ادب کو اپنے فکر و فن سے اس طرح مالا مال کیا کہ رہتی دُنیا تک اُن کا نام باقی رہے گا۔ یوں تو وہ اپنی غیر معمولی ذہانت، تخلیقی صلاحیت اور اختراعی قوت کی بدولت ایک ہمہ گیر اہلِ قلم تھے لیکن گجرات کے اہلِ قلم حضرات کا کہنا ہے کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے وہ گجراتی زبان میں اپنے وقت کے عظیم ترین شاعر تھے۔ اُن کے انتقال سے ہندوستان کا ایک ایسا کوہ وقار شاعر ہم سے جدا ہو گیا ہے جس کی نکتہ رس نگاہ ہندوستانی تمدن کی گہرائی میں دُور تک پہنچتی تھی اور اس نکتہ رس نگاہ کی بدولت اُنھوں نے ہندوستانی ادب کو دو مختلف جہتوں سے آشنا کیا۔ ان میں سے ایک تو ہے روایت کا احترام اور دُوسری ہے روایت کی غلامی سے آزادی، یا روایت کے کٹر پن سے بغاوت، یعنی یا وایام سلف تو ہمیشہ اُن کے دل میں رہی لیکن ساتھ ہی وہ خرد کو غلامی سے آزاد کرنے کی کاوش میں بھی مصروف رہے۔ اوما شنکر جوشی کی شاعری ایک مفکر شاعر کی شاعری تھی، ایک ایسے مفکر شاعر کی شاعری جو سر سے پاؤں تک ہندوستان کی صالح روایات میں ڈوبا ہوا تھا اور جس نے ان روایات کی تفسیر و تعبیر میں اپنی تخلیقی اور فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان کی تشکیلِ نو ہی نہیں کی بلکہ انھیں ادب العالیہ کا پیکر بھی عطا کیا اور ادب العالیہ کی رُوح بھی۔ اس اعتبار سے جب ہم اُن کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اُنھیں بھی وہی اندازِ فکر ودیعت ہوا تھا جو قسامِ ازل کی طرف سے اقبال کے حصّے میں آیا تھا۔ دُنیا کے اکثر مفکر شعراء کی طرح وہ بھی مذہب کی کورانہ تقلید کے مخالف تھے بلکہ عملی اعتبار سے ایک انقلابی بھی تھے اور مذکورہ غیر مقلدانہ روش اور انقلاب پسندی دونوں فکر اور فن کے امتزاج کی صورت میں اُن کی شاعری میں نمایاں تھیں۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کا درمیانی زمانہ گجراتی ادب کے لیے ایک بہت ہی اہم زمانہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہے۔ یہ زمانہ اوماشنکر جوشی کی جوانی کا زمانہ تھا اور اِسی زمانے میں وہ مہاتما گاندھی کے زیرِ اثر آئے۔ پریم چند نے کئی برس قبل اُردو افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں اور اقبال نے شاعری میں حرّیتِ فکر کی جو شمع جلائی تھی اس کی روشنی صرف اُردو ادب ہی تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ اس نے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اہلِ قلم اور ادب کو بھی متاثر کیا۔ پریم چند کا ادب تو خاصی حد تک مہاتما گاندھی کے انوارِ فکر و کردار سے چمک رہا ہے لیکن اوماشنکر جوشی تو یہاں تک گاندھی جی کے علم و عمل سے متاثر ہوئے کہ ان کا جذبۂ شوق اُنھیں قید خانے کی چاردیواری کے اندر لے گیا اور جب وہ قید خانے سے باہر آئے تو گویا سونا آگ سے نکل کر کندن بن چکا تھا۔ یہ اُن کی شاعری کے اُٹھان کا دور تھا۔ اُن کی اس دور کی نظمیں نئی اقدار کی خوشبو سے مہک بھی رہی ہیں اور ان کے دل میں بھڑکی ہوئی آگ کی بدولت دہک بھی رہی ہیں۔

اوماشنکر جوشی کی تحریریں ـــــ نظم ہے یا نثر ـــــ نہ تو علمِ کتابی کے بوجھ سے دبی ہوئی ہیں نہ ہی ادّعائے فضیلت کے مُردہ بوجھ سے۔ ان کی شاعری شگفتگی اور تازگی کا ایک نمونہ ہے اور ان کی نثر روایتی اندازِ بیان سے پاک ہے۔ اُن کی نظم و نثر کے محاسن اُن کی نظم و نثر کے انگریزی ترجموں میں بھی قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہوں، استعاروں اور علامت کا حُسن قاری کو اُسی طرح مسحور کرتا ہے جس طرح ان کی فکری گہرائی اور ان کا اندازِ بیان۔

۱۹۳۹ء میں چھپے ہوئے اُن کے مجموعۂ کلام پر اُنھیں ۱۹۴۸ء میں "گیان پیٹھ ایوارڈ" ملا۔ ۱۹۷۰ء میں کانگریس (آئی) کی حکومت نے اُنھیں راجیہ سبھا کا رُکن نامزد کیا لیکن ۱۹۷۵ء میں جب مُلک میں ایمرجنسی کا نفاذ ہوا تو اُنھوں نے پوری شدّ و مد سے حکومت کی مخالفت کی اور جے پرکاش نارائن کی تحریک صحیح تھی یا غلط صرف یہ کہنا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

چاہتا ہوں کہ راجیہ سبھا کی رُکنیت انھیں اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت سے باز نہ رکھ سکی۔

اپنی ادبی زندگی کی مصروفیات کے باوجود اُنھوں نے ملک میں انتظامی قسم کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں اور اِس ضمن میں اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ وہ شانتی نکیتن میں وشوابھارتی کے وائس چانسلر بھی رہے اور ساہتیہ اکیڈیمی کے چیئرمین بھی۔

پروفیسر اوما شنکر جوشی کے ساتھ راقم التحریر کی ملاقاتوں کی ابتداء اسی ساہتیہ اکیڈیمی کے زمانے میں ہوئی۔ میں ۱۹۷۷ء میں پہلی بار ساہتیہ اکیڈیمی کا اور ساتھ ہی اکیڈیمی کے اُردو ایڈوائزری بورڈ کا رُکن منتخب ہوا۔ اُسی سال پروفیسر جوشی ساہتیہ اکیڈیمی کے صدر منتخب ہوئے۔ ساہتیہ اکاڈمی کے اکثر اہم فیصلے اُن کے زمانے میں ہوئے۔ اُن کے دورِ صدارت میں ساہتیہ اکیڈیمی کا ایک سالانہ اجلاس بھوبنیشور میں ہوا۔ بھوبنیشور سے کلکتہ اور کلکتہ سے دہلی تک میں اُن کا ہم سفر تھا۔ رستے میں بات چیت علمی اور ادبی موضوعات کے متعلق رہی۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر جوشی علم کا ایک سمندر ہیں۔ دُنیا کی ادبی تحریکوں کے متعلق اُن کی واقفیت اور اُن پر جوشی صاحب کا تبصرہ میرے لیے حیرت کا باعث بھی رہا اور میرے علم میں اضافے کا سبب بھی۔

۱۹۷۸ء میں مجھے سوویت رائٹرز یونین (ماسکو) کی جانب سے سٹرڈوس کی دعوت ملی۔ تین یونی ورسٹیوں (ماسکو، لینن گراڈ اور ریگا) میں مجھے اُردو ادب پر تین لیکچر دینا تھے۔ اُسی زمانے میں وہاں تالستائی کی ایک سو پچاسویں سالگرہ منائی جارہی تھی۔ پروفیسر جوشی اُس میں مدعو تھے۔ مجھے اُن کے دعوت نامے کا علم نہیں تھا۔ میں جب ماسکو پہنچا تو دُوسرے روز مجھے سفیرِ کبیر ہندشری اِندر کمار گجرال کے پرنسپل سیکرٹری اور میرے عزیز دوست ڈاکٹر کے ایل گاندھی نے بتایا کہ آج پروفیسر جوشی' تالستائی صدی تقاریب میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

شرکت کے لیے ماسکو پہنچ رہے ہیں۔ تقاریب کے شروع ہونے میں ابھی دو چار روز باقی تھے۔ میرے پوچھنے پر کہ جوشی صاحب کہاں قیام کریں گے۔ گاندھی جی نے کہا کہ اسی رسیا ہوٹل میں جس میں آپ مقیم ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اُن کا کمرہ میرے کمرے سے قریب ہی ہے۔ دو چار کمرے چھوڑ کر ——— یہ اطلاع میرے لیے دلی مسرّت کا باعث ہوئی کہ مدّت کے بعد اِتنے بڑے شاعر اور عالم سے پھر ملاقات کا موقع میسر ہوگا.....اور کمرے کی قُربت پر اس لیے خوشی ہوئی کہ غالباً رسیا ہوٹل دُنیا کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ اس میں بہ یک وقت چھ ہزار مہمانوں کے قیام کا انتظام ہے۔ اور کمرہ اگر دُور ہو تو مجھ ایسوں کے لیے ہوٹل کی غلام گردشوں میں کھو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ دو ایک بار ایسا ہوا بھی کہ اپنے کمرے تک واپس آنا دشوار ہو گیا۔

تو ڈاکٹر گاندھی جب جوشی صاحب کو ایر پورٹ سے لے کر آئے تو میں اپنے فلور کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ گاندھی جی جوشی صاحب کو لے کر وہیں آ گئے۔ پروفیسر جوشی بڑے تپاک سے ملے۔ اور بے تکلفانہ انداز میں گویا ہوئے کہ آزاد صاحب، دہلی میں تو آپ ملتے نہیں۔ اس لیے دیکھئے اب آپ سے ملنے کے لیے ماسکو آنا پڑا۔ میں نے عرض کیا کہ میں کئی برس سے کشمیر میں ہوں۔ دہلی میں ہوتا تو کئی بار آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکا ہوتا۔ کہنے لگے کہ ساہتیہ اکاڈمی کا آئندہ سالانہ اجلاس ہم عن قریب گوا میں منعقد کر رہے ہیں اس میں پھر کچھ دن ساتھ رہنے کا موقع ملے گا۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

اگرچہ میرا سفرِ رُوس کا دعوت نامہ صرف یونی ورسٹیوں میں لیکچروں کے سلسلے میں تھا لیکن سوویت رائٹرز یونین کی چیئر پرسن مریم سلگنیک نے میرا پروگرام ایسا عمدہ بنایا کہ تالستائی کے جشنِ سالگرہ میں شرکت کو (یاسنا پالیانا اور ماسکو) دونوں شہروں میں میرے پروگرام میں شامل کر دیا۔ گویا جوشی صاحب کے ساتھ ہمسفری کا ایک اور موقع مل گیا۔ اس

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سفر میں پروفیسر نامور سنگھ، ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر گرپ سے بھی خوب ملاقاتیں رہیں۔ یہ تینوں حضرات سوویت رشیا انڈیا فرینڈ شپ ایسوسی ایشن کی دعوت پر وہاں پہنچے تھے، تالستائی کی سالگرہ تقاریب میں شرکت کے لیے۔

اس سفر میں اہلِ رُوس نے پروفیسر جوشی کی عزت افزائی اور قدر شناسی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ تالستائی کی قبر پر پھول چڑھانے کا شرف اُنھیں حاصل ہوا۔ ماسکو کے بالشائے تھیٹر میں تالستائی کی یاد میں سوویت رائٹرز یونین کے زیرِ اہتمام بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں اگرچہ یو ایس ایس آر کے صدر برزنیف بھی موجود تھے، وزیرِاعظم کوسی گن بھی اور وزیرِ دفاع گرومیکو بھی، ہندوستان کے سفیرِ کبیر اِندر کمار گجرال کے علاوہ اور ملکوں کے سفرائے کبیر بھی' لیکن وہاں تقریر کرنے کا اعزاز سوویت رائٹرز یونین نے صرف تین اہلِ قلم حضرات کو بخشا جس میں ایک ہمارے پروفیسر جوشی تھے۔ دُوسرے دو حضرات میں ایک رُوس کے شاعرِ گروکیو تھے اور تیسری پولینڈ کی ایک خاتون اہلِ قلم۔ پروفیسر جوشی نے ہندوستانی میں تقریر کی جس کا رُوسی ترجمہ خود مریم سلگنیک نے اہلِ جلسہ کے سامنے پیش کیا۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑا اعزاز تھا کیونکہ مریم سلگنیک کو رُوسی اہلِ قلم میں بہت اُونچا مرتبہ حاصل ہے۔

ریگا (لیٹویا) سے واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ مریم سلگنیک نے میرے پروگرام میں تاجکستان کا سفر بھی شامل کر دیا ہے تاکہ وہاں یونی ورسٹی آف تاجکستان (دوشنبہ) میں علامہ اقبال کے فکر وفن پر میں ایک لیکچر دوں۔ تو جس روز میں دوشنبہ روانہ ہو رہا تھا اُسی روز پروفیسر جوشی غالباً کریمیا جا رہے تھے۔ ماسکو کے ایرپورٹ ہی پر اُن سے ملاقات ہوگئی۔ جتنی دیر ایرپورٹ پر ہم رُکے رہے پروفیسر جوشی بات چیت میں علم وادب کے گوہر لٹاتے رہے۔ اُن کی شیریں بیانی آج بھی میرے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔

اسی سفرِ ماسکو کے دورانِ قیام میں ایک دن میرا بالکل خالی تھا۔ اُس روز میرے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

دوست تقی حیدر نے مجھے دن کے کھانے کی دعوت دی۔ انھوں نے دو تین اور ہندوستانی دوستوں کو بھی دعوت دی تھی۔ وہ کوئی صبح دس بجے تشریف لائے، مجھے اپنے گھر لے گئے اور شام کے چھ بجے تک اُن کے ہاں محفل جمی رہی۔ میں جب واپس ہوٹل پہنچا تو پروفیسر جوشی اپنے کمرے کے باہر ٹہل رہے تھے۔ مجھ سے انھوں نے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ تقی حیدر اپنے ساتھ لے گئے تھے وہاں بڑی عمدہ محفل رہی۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ آج آپ کا کیا پروگرام رہا کہنے لگے آج میرا دن خالی تھا اور میں کمرے ہی پر رہا۔ مجھے یہ سُن کر بہت دُکھ ہوا اور معذرت طلب کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ میں اسی خیال میں تھا کہ آپ کی آج کہیں مصروفیت ہوگی۔ اگر معلوم ہوتا کہ آج آپ فارغ ہیں تو میں اور تقی حیدر آپ سے درخواست کرتے کہ ہمارے ساتھ ہی چلیے۔ تقی حیدر کے وہاں بہت عمدہ محفل جمی تھی۔ اس پر انھیں بھی افسوس ہوا کہ کمرے پر وہ بے کار ہی بیٹھے رہے۔ تقی حیدر کے یہاں گپ شپ میں لطف رہتا۔ میں نے محسوس کیا کہ انھیں دن بھر کمرے میں بے کار رہنے کا خاصا ملال ہے۔

اس وقت تک کمرے کے باہر برآمدے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ شاید وہ تھک گئے تھے چنانچہ مجھے ساتھ لے کر وہ اندر آگئے اور علامہ اقبال کی شاعری پر انھوں نے بات چیت شروع کی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ انھیں اقبال کے متعدد اشعار یاد تھے۔ کافی دیر تک اقبال اور اقبال کی شاعری زیر بحث رہی ——— ترانۂ ہندی سے لے کے آل انڈیا مسلم لیگ کے الٰہ آباد سیشن تک، اور الٰہ آباد سیشن سے "شعاعِ اُمید" تک۔ اور میں نے دیکھا کہ اقبال کے لیے اُن کے دل میں عزت و احترام کے قابلِ قدر جذبات موجود ہیں اور اقبال کو وہ دُنیا کے عظیم شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔

اقبال کے ذکر سے یاد آیا کہ ۱۹۷۷ء میں جب آل انڈیا اقبال صدی تقاریب کمیٹی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کے زیرِ اہتمام دہلی میں ''جشنِ اقبال'' منانے کا فیصلہ ہوا تو کمیٹی کی ایک نشست یہ طے کرنے کے لیے منعقد ہوئی کہ صدارت کی ذمہ داری کس کو سونپی جائے۔ علی سردار جعفری نے اِس منصب کے لیے پروفیسر اُوما شنکر جوشی کا نام پیش کیا اور اکثر اراکین نے جن میں شری اِندر کمار گجرال، شری ڈی پی دھر، شری وی شنکر، ڈاکٹر قمر رئیس، محمد یوسف ٹینگ اور راقم التحریر شامل تھے' اِس تجویز کی پُرزور تائید کی۔ بعض اراکین ایسے بھی تھے جو اُوما شنکر جوشی کے نام اور کام سے ناواقف تھے۔ اُنھیں یہ نام سُن کے حیرت ہوئی۔ لیکن جب اُوما شنکر جوشی نے خطبۂ صدارت پڑھا اور اُسے اِن الفاظ پر ختم کیا

> " The poet Iqbal will remain a golden link between Pakistan and India and with his cosmic vision will attract pilgrims from other parts of the World to participate in celebrations like the present one, so appropriately hosted by India. At every consicutive centenary the participants will feel more and more justified in vouching for the fact that his verse is ever fresh and ever now taza ba taza new ba new.

تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا اور سامعین علی سردار جعفری کے اِس حُسنِ انتخاب کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے کہ اُنھوں نے اِقبال صدی تقاریب کی صدارت کے لیے اوُما شنکر جوشی کا نام تجویز کیا تھا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

چند جُملے

(جوش صاحب اور کرشن چندر کی یاد میں)

میری زندگی میں ایسے نقوش جن سے میری شخصیت بھی متاثر ہوئی اور میرا ادب بھی متاثر ہوا خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ میں خوش قسمتی سے ایسی شخصیتوں کے قدموں میں بیٹھا ہوں جنھوں نے میری زندگی، میری شخصیت اور میرے ادب کو اس حد تک متاثر کیا کہ اُس کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔ ویسے جوش صاحب اور کرشن چندر سے پہلی ملاقات کے بارے میں دو ایک مضامین پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ لیکن یہ تحریر اُن مضامین سے مختلف ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی کے ساتھ میری دو مُلاقاتیں آزادی سے پہلے لاہور میں ہوئی تھیں لیکن وہ ملاقاتیں میری طرف سے ''آداب عرض، آداب عرض'' ہی تک محدود رہی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تھیں۔ صحیح طور پر ملاقاتوں کی ابتداء آزادی کے بعد دہلی میں ہوئی جب ۱۹۴۸ء کے شروع میں وہ پبلی کیشنز ڈویژن میں ایڈیٹر اُردو مقرر ہو کے آئے اور اُسی دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اُردو کے طور پر میرا تقرر ہوا۔

پہلا ہی دن تھا' میں اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے اُن کے چیمبر میں پہنچا۔ داخل ہوتے ہی میں نے کہا "آداب عرض جناب' مزاج اچھے ہیں؟" جوش صاحب مجھے دیکھتے ہی کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور "آداب عرض ہے" کہہ کے مجھ سے مخاطب ہوئے اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے احتراماً دونوں ہاتھ بڑھا کے اُن کے ساتھ مصافحہ کیا اور ساتھ ہی عرض کیا "جناب آپ تشریف رکھیے" اُنھوں نے مجھے "تشریف" رکھنے کو کہا اور جب تک میں کرسی پر نہ بیٹھ گیا وہ بھی اپنی کرسی پر نہ بیٹھے۔

یہ سارا معاملہ میرے لیے بڑی اُلجھن کا معاملہ تھا۔ اتنے بڑے شاعر، میں اُن کے سامنے مبتدی' وہ میرے افسر' میں اُن کا اسسٹنٹ' یا اللہ! کہاں پھنس گئے۔ یہ سلسلہ کہاں تک چلے گا۔

دُوسرے دن دفتر میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد میں پہلے دن کی طرح اُن کے چیمبر میں پہنچا تو پھر وہی نقشہ تھا۔ پہلے اُنھوں نے مجھے کرسی پر تشریف رکھنے کو کہا اور بعد میں خود بیٹھے۔ اب میں نے سوچا کہ اپنا ردِعمل بیان کر دوں تو میں نے عرض کیا کہ میں آپ کے سامنے ہر طرح سے جونیئر ہوں۔ میرے حاضر ہونے پر آپ کرسی چھوڑ کر اُٹھا نہ کریں۔ ان تمام باتوں سے مجھے خاصی embersement ہوتی ہے۔ میں نے یہی لفظ ایمبیرس منٹ ہی استعمال کیا۔ اُنھوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کی نفسیاتی اُلجھن کے پیشِ نظر میں اپنے آداب اور اپنی تہذیب کو ترک کر دوں۔

اب تیسرے دن جو میں اُن کے چیمبر میں گیا تو میں نے اپنے دہرائے ہوئے ردِعمل کو دہرانا ضروری نہ سمجھا اور آداب وغیرہ کے بعد اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ میری خوش نصیبی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ میری زبان پر نظر رکھیں اور جہاں کہیں آپ کو اس میں سقم نظر آئے تو آپ مجھے آگاہ کریں اور میری رہنمائی کریں۔

اس پر اُنھوں نے فرمایا کہ ہاں اکثر لوگ ایسا کہتے ہیں لیکن جب ہم اُن کی اغلاط کی تصحیح کرتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہمی تعلقات پر خراب اثر پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے تعلقات کے خراب ہونے کا کوئی اندیشہ یا امکان نہیں ہے کیونکہ ایک تو اس بات کی گزارش میں خود آپ سے کر رہا ہوں۔ دوسرے آپ میرے والدِ محترم کے دوست ہیں اس لیے حدِ ادب کے اندر رہنا میرا فرض ہے اور میں ویسے مزاجاً بھی حدِ ادب کے اندر ہی رہنے کا قائل ہوں۔

اب اگلے دن جو میں اُن کے کمرے میں حاضر ہوا تو حسبِ معمول میرے مُنہ سے نکلا ''آداب عرض جناب، مزاج اچھے ہیں؟'' تو جوش صاحب نے کہا'' دیکھئے جناب (ہوسکتا ہے کہ جوش صاحب میرے لیے جناب کا لفظ استعمال کرتے ہوئے طنز سے کام لے رہے ہوں) بہرطور کہا اُنھوں نے یہ کہ'' دیکھئے جناب مزاج اگرچہ مختلف کیفیتوں کا مجموعہ ہے لیکن واحد ہے جمع نہیں ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ'' میں نے تو احترام کے خیال سے فعل میں جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔'' اُنھوں نے جواب میں کہا کہ احترام کی بات بالکل بجا ہے لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ آپ غلط زبان استعمال کریں۔

اب اس بات کے دوران میں ہم دونوں کھڑے ہیں۔ جب تک وہ کرسی پر نہ بیٹھیں میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ بہرطور میں نے جواب میں عرض کیا کہ جب ہم ایک فرد کو احترام کے خیال سے آپ کہہ کے مخاطب کرتے ہیں تو اس کے ساتھ فعل جمع ہی کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً آپ اچھے ہیں؟ یا آپ کہاں تشریف لے جائیں گے۔ اس کے جواب میں اُنھوں نے اتنا ہی کہا کہ یہ ''غلط ہے منطق نہیں ہے'' اور میں خاموش ہو گیا۔ اور یہ کہنا میں نے مناسب

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نہ سمجھا کہ آخر زبان میں چلن بھی تو کوئی چیز ہے لیکن اپنے اس خیال کے باوجود کہ چلن کی بھی اہمیت ہے میں نے اُن کے ساتھ اس مسئلے پر بحث نہیں کی۔ وہ مجھے اسی طرح زبان کی باریکیوں اور نفاست سے آگاہ کرتے رہے اور میں اُن سے فیض پاتا رہا۔

زبان کی اصلاح کا یہ پہلے دن کا سبق کہ یہ "غلط ہے منطق نہیں ہے" میرے دل و جاں میں اُتر گیا اور میں ہمیشہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ میری شخصیت اور میرا ادب دونوں اس سے متاثر ہوئے ہیں اور آج تک اس سبق سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ یہ نقش میرے لیے نقشِ دوام بن گیا۔

لیکن میں اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ جوش صاحب زبان کے معاملے میں بہت لذت پسند تھے۔ بہت rigid تھے۔ اگر ہم اُن کی باتوں کو یا زبان کے بارے میں اُن کے خیالات کو سو فی صد قبول کرتے ہیں تو اس کا زبان پر غیر مفید اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ محاورہ اور روزمرہ دونوں چلن ہی کی پیداوار ہیں اور جوش صاحب کی بات پر سو فی صد عمل کرنے سے زبان کی ترقی رُک بھی سکتی ہے۔ اس لیے مجھے اس سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ ہمارے بزرگوں اور اساتذہ نے جو کچھ لکھا ہے اور جو کچھ وہ ہم سے کہتے ہیں ہمیں اُسے بڑی سنجیدگی اور نیک نیتی سے پڑھنا چاہئے، سنجیدگی سے سننا چاہئے لیکن اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اس مشورے کو ہم کہاں تک قبول کر سکتے ہیں۔ یہاں اس وقت مجھے اپنے مرحوم دوست مجروح سلطان پوری کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جس میں اُنھوں نے میرے اسی خیال کو جو میں نے کئی جملوں میں بیان کیا ہے دو ہی مصرعوں میں اس خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ کسی اور وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ مجروح کہتے ہیں ؎

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

ممکن ہے حضرات آپ یہ سُن کر یہ محسوس کر رہے ہوں کہ میں نے دو متضاد باتیں کر دی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہیں تو حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جوش صاحب کی بات میری زندگی کا ایک نقش بن چکا ہے اور صحیح اور با محاورہ زبان کے لیے میرے دل میں جو محبت اور احترام کا جذبہ ہے وہ جوش صاحب کی مذکورہ بالا بات اور اُن کے ساتھ نو برس کی رفاقت ہی کی دین ہے اور یہ اسی رہنمائی ہی کا نتیجہ ہے۔

.....

یہ جو میں نے عرض کیا ہے یہ ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے۔ اب ایک واقعہ ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کا بھی سُن لیجیے۔ اُن دنوں میرا قیام لاہور میں تھا۔ کرشن چندر بھی لاہور ہی میں رہتے تھے۔ ایک دن کی بات ہے کہ میں گھر سے مکتبہ اُردو کو جا رہا تھا۔ کرشن شاید اپنے دفتر سے آ رہے تھے یا مکتبہ اُردو سے۔ سرکلر روڈ پر دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کی بات چیت شروع ہوئی۔ اچانک اُنھیں کچھ یاد آ گیا۔ بولے سُنا ہے کل تم "ادبی دُنیا" کے دفتر میں یوسف ظفر کے ساتھ اُلجھ گئے اور اس بات پر مُصر رہے کہ کرشن چندر پریم چند کے قد و قامت کا نثر نگار ہے۔ میں نے کہا کہ الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن ہاں، کچھ ایسی ہی بات میں نے کہی تھی۔ مجھ سے نصیحت کے انداز میں کہنے لگے کہ ادبی بحث میں کسی کے ساتھ اُلجھنا نہیں چاہیے۔ تنقیدی مقالے لکھنا شروع کرو تو یہ اُلجھنے کی عادت ختم ہو جائے گی۔ جس دن تم مجھ سے پہلی بار ملنے آئے تھے تو میں دیکھ رہا تھا کہ جب اقبال کے اشعار پر میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تو تمھارے چہرے پر انقباض کی کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ ادبی بحث میں کسی بات کے بُرا ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کرشن چندر کی یہ بات میرے دل پر نقش کالحجر بن گئی۔ صرف یہی نہیں کہ تنقیدی مضامین میں نے باقاعدگی سے لکھنا شروع کر دیے بلکہ اختلاف رائے کو آج میں اُتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی اتفاق رائے کو۔ ہو سکتا ہے کہ کرشن چندر کے مشورے سے پہلے میں اختلاف رائے اور مخالفت دونوں کو ہم معنی الفاظ سمجھتا ہوں گا لیکن کرشن کے مشورے نے مجھے صراطِ مستقیم پر چلا دیا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ضامن علی خان: چند یادیں

(چودہ برس پُرانا ایک غیر مطبوعہ مضمون)

تمھاری نیکیاں زندہ تمھاری خوبیاں باقی

آج سے چار پانچ برس قبل تک میں ضامن علی خان کے نام اور کام سے ناواقف تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے اُنھیں پہلی بار انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے دفتر اُردو گھر میں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے تعارف کرایا تھا لیکن جلد ہی اُن کا نام میرے حافظے سے اُتر گیا اگرچہ اُن کے مُسکراتے ہوئے چہرے نے اور اُس تپاک نے جس سے وہ ملے تھے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔

بات یہ ہے کہ انجمن کے دفتر میں دہلی سے آنے والے اُردو اہلِ قلم کا خواہ وہ ہندوستان کے مختلف حصّوں سے آئے ہوں یا پاکستان سے' ایک تانتا بندھا رہتا ہے۔ جب بھی میں انجمن کے دفتر میں جاتا ہوں، ڈاکٹر خلیق انجم سے ملنے یا کسی اور کام سے' اُردو کے نئے اور پُرانے اہلِ قلم سے اکثر ملاقات ہوتی ہے اور ہر ایک کے نام یا چہرے کو یاد رکھنا،

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بالخصوص اس وقت جب کہ میری عمر اُنہتر برس کو پہنچ چکی ہے، میرے لیے بعض دفعہ آسان نہیں رہتا۔

خیر ضامن علی خان سے ملاقات ہوئی اور میں بھول گیا۔ لیکن چند روز بعد اُن کا ایک خط مجھے جس میں اُنھوں نے لکھا کہ میں اندرا جی پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں۔ میں نے سُنا ہے آپ کی اندرا جی سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ ایک تو ان ملاقاتوں پر مبنی مضمون کی اُنھوں نے فرمائش کی دُوسرا یہ لکھا کہ اگر اندرا جی کی تصویریں آپ کے پاس ہوں تو وہ بھی مجھے بھیج دیں۔ میں نے اُنھیں جواب میں لکھا کہ اندرا جی سے میری تمام ملاقاتیں فرائض منصبی کے سلسلے میں رہی ہیں بالخصوص جموں و کشمیر میں اُن کی آمد کے موقعے پر۔ علمی یا ادبی حیثیت سے تو وہ شاید مجھے جانتی بھی نہ ہوں۔ میں نے بھی کبھی کسی ملاقات میں اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ اور تصویریں بھی اس سلسلے میں میرے پاس بہت ہیں لیکن اُن کا تعلق بھی سرکاری ملاقاتوں سے ہے۔ یعنی اُن کے ساتھ میں اگر تصویر میں موجود ہوں تو ساتھ ہی دُوسرے سول اور فوجی افسر بھی ہیں اس لیے یہ تصویریں بھی آپ کے کام کی نہیں ہوں گی۔

اُنھوں نے جواب میں لکھا کہ آپ مضمون بھی لکھ کے بھیجئے اور چند تصویریں بھی۔ تصویریں استعمال کے بعد واپس کر دی جائیں گی۔

اب یہ مجھے یاد نہیں کہ یہ خط اُنھوں نے کس ادارے کی طرف سے لکھا تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ لیٹر ہیڈ پر ڈاکٹر حیات اللہ انصاری' ایم۔ پی کا نام اس ادارے کے صدر کے طور پر موجود تھا۔ خود ضامن صاحب کا نام سیکرٹری کے طور پر درج تھا۔

بہر طور میں بر بنائے مصروفیت مطلوبہ مضمون تو نہ لکھ سکا لیکن غالباً اندرا جی کی دو ایک نادر تصویریں میں نے اُنھیں بھیج دیں۔ مضمون کی یاد دہانی کے طور پر دو ایک خطوط اُن کے ملے لیکن مکروہاتِ دنیوی نے مجھے اس موضوع پر قلم اُٹھانے کی مہلت نہ دی۔ اب معلوم نہیں میری بھیجی ہوئی تصویریں اُنھیں ملیں یا نہیں اور مذکورہ کتاب شائع ہوئی یا نہیں۔ میں اس بات

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سے خالی الذہن ہو گیا۔

ضامن علی خان نے اُردو کی خدمت کے لیے کئی ادارے قائم کر رکھے تھے۔ جوں جوں اُن کے ساتھ میری ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا گیا میرا یہ یقین پختہ تر ہوتا گیا کہ ضامن علی خان اُردو کے سچے خادم اور بہی خواہ ہیں اور اُن خدمت گزاروں میں سے نہیں ہیں جو اپنی خدمتِ اُردو کو دُنیائے اُردو میں ترقی کے لیے زینے کے طور پر استعمال کر رہے ہوں۔

کچھ مدت بعد اُنھوں نے اپنی مرتب کی ہوئی ایک کتاب مجھے بھیجی۔ یہ جگر صاحب کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے متعلق تھی۔ یہ اُن کی اوّلین ادبی کاوش تھی اور اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ جگر اُن کے محبوب شاعر ہیں۔ جگر صاحب ایک زمانے میں میرے بھی محبوب شاعر رہے ہیں۔ جگر کی شاعری کو پسند کرنا میرے نزدیک خوش مذاقی کی دلیل تھی اور ہے ـــــــ اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ جگر ایک زمانے میں میرے بھی محبوب شاعر تھے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب جگر میرے محبوب یا پسندیدہ شاعر نہیں ہیں بلکہ میں محض یہ کہہ رہا ہوں کہ ایک زمانے میں جگر میرے اعصاب پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ میرا جوانی کا زمانہ تھا اور "در ایامِ جوانی چنانکہ اُفتد دانی" میرے مجموعۂ کلام "بوئے رمیدہ" کی اکثر غزلیں جگر کی زمینوں میں ہیں اور ان میں جگر کے اثرات بڑی حد تک جھلکتے ہیں۔ اگر چہ میں اُس زمانے میں جذباتی طور پر ترقی پسندی سے وابستہ ہو چکا تھا (اور اب بھی ہوں) لیکن جگر میرے دل و دماغ پر مسلط تھے مگر اتنا بھی نہیں کہ اقبال کا دامن میرے ہاتھ سے نکل جائے۔

اُس زمانے میں اقبال کے اِن اشعار کا مفہوم بھی میں اپنی کیفیات میں ڈھال لیا کرتا تھا۔

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذّتِ طلب

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

چنانچہ اب جو ضامن علی خان سے دہلی میں ملاقات ہوئی تو میں نے اُن کے ساتھ ایک دلی قُرب محسوس کیا۔ جگر صاحب کے تعلق سے۔ اور اس ملاقات میں میری طرف سے بھی وہی تپاک موجود تھا جو ہم دونوں کی پہلی ملاقات میں ضامن علی خان میں مجھے نظر آیا تھا۔

ساغر نظامی کے اِنتقال پر ضامن علی خان نے اُن کے متعلق ایک ضخیم کتاب مرتب کی۔ اس کے لیے بھی اُنھوں نے مُجھ سے مضمون کی فرمائش کی۔ ساغر صاحب پر مضمون تو میں نہ لکھ سکا (اگر چہ مُجھے لکھنا چاہئے تھا کیونکہ ساغر صاحب سے میرے مراسم دوستانہ ہی نہیں برادرانہ بھی تھے، اور یہ مضمون ابھی تک مُجھ پر قرض ہے) لیکن چند اشعار جو میں نے خاصی مدّت قبل ساغر صاحب کے ایک طویل علالت سے شفایاب ہونے کے وقت کہے تھے میں نے اُنھیں بھیج دیئے۔ جب ساغر نظامی پر یہ کتاب چھپ گئی تو ضامن علی خان نے اس کا ایک نسخہ مُجھے بھیجا اور کتاب دیکھ کر میں اُن کی وسعتِ نظری کا بھی قائل ہو گیا اور سلیقہ مندی کا بھی۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ضامن علی خان اُردو کے ایک بے غرض خادم تھے۔ مراد آباد میں اُن کے ظروف سازی کے کارخانے تھے۔ اُن سے کماتے تھے اور اُردو کی ترویج و اشاعت پر خرچ کرتے تھے۔ اُردو کی بقا اور فروغ کے لیے اُنھوں نے ایک ادارہ "غالب میموریل سوسائٹی" کے نام سے بھی قائم کیا تھا۔ اس کے صدر بھی ڈاکٹر حیات اللہ انصاری ہیں۔ ضامن مرحوم اس کے بھی سیکرٹری تھے۔

ایک دن دہلی کی ایک ملاقات میں جب کہ عزیزم محبوب حسین نظر بھی اُن کے ساتھ تھے کہنے لگے' آزاد صاحب، ہم دہلی میں غالب میموریل سوسائٹی کی جانب سے آپ کے اعزاز میں ایک جلسہ کرنا چاہتے ہیں اور اس میں ہم آپ کو آپ کی ادبی خدمات کی بنا پر ایوارڈ بھی دینا چاہتے ہیں۔ آپ کی اجازت درکار ہے۔ اُنھوں نے اس جلسے کا جو نقشہ بنایا تھا اُس

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کی تفصیل سے بھی مجھے آگاہ کیا۔ محبوب حسین ظفر نے بھی اُن کی ہمنوائی کی۔ دراصل محبوب حسین ظفر اور ضامن علی خان کا معاملہ یک جان و دو قالب کا معاملہ تھا۔ نہ جانے اس سانحہ، جانکاہ سے محبوب حسین ظفر پر کیا گزری ہوگی۔

اب کسی بھی شاعر یا ادیب کو یہ پیش کش کی جائے تو اُسے اس سے مسرّت ہوتی ہے۔ مجھے بھی اس پیش کش سے مسرّت ہوئی اور میں نے اُن سے کہا کہ میں چند روز میں عرض کروں گا۔ میرا خیال تھا جموں جا کر اپنے فیصلے کے متعلق اُنھیں لکھوں گا۔

خدا کے فضل و کرم سے راقم التحریر کو اس وقت تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی یونی ورسٹیوں اور علمی اور ادبی اداروں کی طرف سے متعدد ایوارڈ مل چکے ہیں جن میں صدرِ پاکستان کی طرف سے دیا ہوا اقبال ایوارڈ بھی شامل ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ بھی، اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا اقبال ایوارڈ بھی، اسلامک سینٹر آف برما کا ایوارڈ بھی، پنجاب یونیورسٹی لاہور کا میڈل بھی اور امریکا اور کینیڈا کی ادبی انجمنوں کے ایوارڈ بھی۔ لیکن یہ سب ایوارڈ اُن اداروں کی جانب سے ہیں جن کے پیچھے بڑی بڑی علمی اور ادبی جماعتیں فروغِ زبان و ادب کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ ضامن علی خان صاحب کے ایوارڈ کا بوجھ اُن کی ذات پر پڑتا ہے۔ اس لیے مجھے جلدی ہاں کرنے میں تامّل تھا۔ میں نے سوچا دہلی بڑا شہر ہے۔ یہاں ضامن علی خان میرے اعزاز میں جلسہ منعقد کریں گے۔ مقررین حضرات آئیں گے، رات کو ڈنر ہوگا، مجھے ایوارڈ دیں گے، معروف قوّال حضرات کو میری غزلیں گانے کی دعوت دیں گے، ان کا ہزاروں روپیہ اُٹھ جائے گا' اس لیے مجھے تذبذب تھا۔

دہلی کے اگلے سفر میں اُردو گھر میں ضامن علی خان سے پھر ملاقات ہوئی اُنھوں نے دہلی کے ریسٹورنٹ کوالٹی میں مجھے' ڈاکٹر خلیق انجم کو' ڈاکٹر اسلم پرویز کو اور محبوب ظفر کو دعوت دی۔ وہاں پھر میرے اعزاز میں جلسے کا اُنھوں نے ذکر کیا۔ اس موضوع پر تمام احباب میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تھوڑی دیر بات چیت ہوئی اور میں نے دلی شکریئے کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور جلسے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

چنانچہ جلسہ ہُوا جس کی رپورٹ مختلف اخبارات میں آ چکی ہے۔ اب اگر میں اس جلسے کی تفصیل بیان کروں تو اس میں میری خودستائی کا پہلو جھلکے گا۔ میرے نزدیک یہ جلسۂ اعزاز جس کی صدارت ڈاکٹر حیات اللہ انصاری نے کی ہر اعتبار سے بہت کامیاب اور بہت بڑا جلسہ تھا۔ اگرچہ اس کے پیچھے متعدد دوستوں کا خلوص تھا اور نیک خواہشات بھی لیکن محنت ایک مردِ واحد کی تھی اور ذاتی سرمایہ بھی اُسی کا تھا۔ میرا دل ضامن علی خان کے لیے جذباتِ تشکر سے لبریز تھا۔

اس جلسے کے بعد غالب میموریل سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر حیات اللہ انصاری کے دولت کدے پر ایک اور دعوتِ طعام ہوئی جس میں پہلی بار مجھ پر اس امر کا انکشاف ہوا کہ ضامن علی خان شعر بھی کہتے ہیں۔ ابھی اُن کی شاعری کی ابتدا تھی۔ اچھے شعر کہتے تھے اور بطور شاعر کے ایک تابناک مستقبل اُن کے سامنے تھا لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے اُنھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ عروسِ سخن کی زُلفیں اُسی انہماک سے سنوار سکیں جس انہماک سے وہ اُردو کی بقا اور فروغ کے لیے کام کر رہے تھے۔

میں نے ابھی جلسۂ اعزاز کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا جلسہ تھا لیکن ضامن علی خان کے نزدیک اس میں ایک کمی رہ گئی تھی۔ پروگرام میں اُنھوں نے یہ شق بھی شامل کی تھی کہ مجھ سے جلسے ہی میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کا انٹرویو لیا جائے گا جو ساتھ ہی ساتھ ٹیپ ریکارڈ بھی ہوتا چلا جائے گا اور اس انٹرویو میں میری پچاس پچپن سالہ ادبی زندگی کے متعلق سوالات کیے جائیں گے۔ موضوع کے بارے میں اُنھوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ گزشتہ پچاس ساٹھ برس میں جن مشاہیر ادب کے ساتھ میرے شاگردانہ، نیازمندانہ اور دوستانہ مراسم رہے ہیں اُن کی زندگی اور کام کے متعلق تا حدِ امکان میں ایسے گوشے منظرِ عام پر

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

لاؤں جو ابھی تک اہلِ نظر حضرات کے سامنے نہیں آئے اور ساتھ ہی اُنھوں نے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ اس طرح کے جو واقعات میری کتاب ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' میں آ چکے ہیں اُن کا اعادہ میں اس انٹرویو میں نہ کروں۔

مجھے پروگرام کا یہ حصّہ بہت ہی پسند آیا کیونکہ اس سے بعض مشاہیرِ ادب کی زندگی کے چند ایسے واقعات محفوظ ہو جاتے جنھیں قلمبند کرنے کی شاید مجھے فرصت نہ مل سکے لیکن جلسے کا پروگرام چونکہ طے شدہ وقت سے بہت آگے نکل گیا تھا اور رات ہو گئی تھی اس لیے پروگرام کے اس حصّے کی باری نہ آ سکی۔

اس جلسۂ اعزاز کے بعد میں جموں آ گیا اور یہاں چند دنوں میں اُن کے دو خطوط ملے جن میں اُنھوں نے لکھا کہ جلسے میں پروگرام کا جو حصّہ وقت کی کمی کے باعث رہ گیا تھا اُس کا اہتمام اب دسمبر میں کیا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے اس پروگرام کی تاریخ بھی قریب قریب طے کر لی تھی لیکن ابھی دسمبر دُور تھا کہ وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو کے چلے گئے۔

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت!

ایک مدّت سے میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں اُردو کی ترقی کے لیے صرف اہلِ قلم حضرات کا تخلیقی یا تنقیدی یا تحقیقی کام کرنا ہی کافی نہیں ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایسے نوجوانوں کا میدانِ عمل میں آنا بھی ضروری ہے جن کی نمائندگی ضامن علی خان کر رہے تھے۔ چنانچہ بہت دن سے ہم میں سے اکثر دوستوں کا خیال یہ تھا کہ اُنھیں انجمن ترقی اُردو کی مجلسِ عام میں لایا جائے۔ اور اب انجمن ترقی اُردو کی طرف سے جو بیلٹ پیپر ملا اس میں اُن کا نام شامل تھا لیکن ابھی بیلٹ پیپر کی واپسی کی تاریخ دُور تھی کہ ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سیکرٹری انجمن ترقی اُردو کی جانب سے یہ خط ملا:

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

''میں انتہائی افسوس کے ساتھ یہ خبر دے رہا ہوں کہ
ضامن علی خان صاحب کا (اکیس اور بائیس) ۲۱ اور
۲۲ کی درمیانی شب کو انتقال ہو گیا ہے۔ مرحوم کا نام
اس بیلٹ پیپر میں شامل تھا جو انجمن ترقی اُردو (ہند)
کی مجلسِ عام میں سات نشستوں کے انتخاب کے سلسلے
میں آپ کو بھیجا گیا ہے۔ اب اس نام کو بیلٹ پیپر سے
خارج تصور فرمایئے۔''

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے اُسی وقت بیوی کو بتایا کہ ضامن علی خان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُس نے جھلاہٹ کے عالم میں کہا کہ ہر بات فنی مذاق کا موضوع نہیں ہوتی۔ اس قسم کا مذاق آپ کبھی نہیں کرتے۔ حیرت ہے آپ کو بھی خیال نہیں آیا کہ اس طرح کے لطیفے نہیں گڑھنا چاہیں۔ میری آواز بھرا گئی۔ میں نے کہا لطیفہ نہیں ہے حقیقت ہے' اور خلیق انجم کا خط میں نے اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ خط پڑھ کے وہ سناٹے میں آ گئی اور نیم بدحواسی کے عالم میں بولی ——— یہ کیا ہو گیا، ابھی چند ہی دن پہلے تو ہم نے اُسے ہنستا بولتا دیکھا، غالب اکیڈیمی میں بھی اور ڈاکٹر حیات اللہ انصاری کے گھر پر بھی ——— یہ کیا ہو گیا' یہ چند دن میں کیا ہو گیا۔ وہ تو ابھی لڑکا تھا' بھلا چنگا تھا..... اُس کی بیوی چھوٹی سی لڑکی ہے، نہ جانے اُس بچاری پر کیا گزر گئی ہو گی.....

دُوسرے یا تیسرے دن اُردو گھر سے شمیم جہاں کا مکتوب ملا' جس میں لکھا تھا:

''ایک افسوس ناک اور دل ہلا دینے والی خبر یہ ہے کہ ہم
سب کا پیارا بھائی، مخلص اور بہت ہی چاہنے اور سب
پر جان دینے والا دوست ضامن علی خان ہم سے رُوٹھ
کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

۲۱ر اکتوبر کو بخار ہُوا۔ سب
لوگ دیکھنے گئے۔ گیارہ بجے رات تک خوب باتیں
کیں۔ دو بجے رات کو ہارٹ فیل ہو گیا۔ خدا مغفرت
فرمائے اُن کی۔ دُعا کے علاوہ ہم اب اُن کے لیے کر
بھی کیا سکتے ہیں.....''

ابھی اس خط کی سیاہی بھی خشک نہیں ہونے پائی تھی کہ دہلی سے عزیزم محبوب ظفر کا خط ملا:

''یہ چند سطور میں دل گرفتہ ہو کر
اور پریشانی کے عالم میں لکھ رہا ہوں کہ تفصیلاً لکھنے کا
یارا نہیں۔ ہمارے غمگسار و رفیق، انتہائی مشفق اور
عزیز دوست ضامن علی خان ۲۲ر اکتوبر کو اچانک
حرکتِ قلب بند ہونے کے بعد اس جہانِ فانی سے
رُخصت ہو گئے۔

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

مزید الفاظ کے لیے مجھے
اپنے گونگے پن اور لفظوں کی کم مائگی کا احساس ہوتا
ہے۔ میں دل گرفتہ ہوں۔ سوچتا ہوں تو سینہ پھٹتا
ہے مگر آدمی کے بس میں آنسوؤں کے سوا کیا
ہے۔ اپنے ساتھ وہ تمام باتیں بھی لے گئے جو
ہمارے لیے اب کسی اور میں نہیں۔ آزاد صاحب'

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میں تو اب بالکل بے سہارا ہو گیا ہوں۔ میرا یار جسے
دیکھے بغیر چین نہ ملتا تھا اب اسے کہاں تلاش کروں۔

آپ کا اپنا

محبوب حسین ظفر

سفارت خانہ، پاکستان، دہلی

یہ ہیں اُس شخص کی محبوبیت کے چند نقوش جو کل تک دہلی کی ادبی محفلوں کی جان تھا، احباب کی انجمنوں میں رُوحِ رواں کی طرح تھا اور آج منوں مٹی کے نیچے آسودہ ہے۔ اب اس سے کون پوچھے اور کس طرح پوچھے کہ

زیرِ خاک آمدہ اے غنچۂ رعنا چونی؟
بے تو ما خستہ مخمویم تو بے ما چونی؟

۷ر نومبر ۱۹۸۸ء

□□□

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

جواہر لعل نہرو

اے حُریت کی شعلہ فشانی کہاں ہے تُو
حُسنِ بیان و حُسنِ معانی کہاں ہے تُو
مشرق کا درد و سوزِ نہانی کہاں ہے تُو
ہندوستاں کے دل کی کہانی کہاں ہے تُو

گلشن! تیرا وہ جوشِ بہاراں کدھر گیا
دریا! تیرا وہ عالمِ طوفاں کدھر گیا

تقسیمِ ہند سے کوئی دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نافذ ہو چکا تھا اور اب اس ایکٹ کے تحت ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے لیے انتخابات ہونا تھے۔ کانگرس اور مُسلم لیگ دونوں انتخاب کے میدان میں کود چکی تھیں۔ یہ انتخابات اگرچہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہو رہے تھے اور مُسلم لیگ نے صرف مُسلم اُمیدواروں ہی کو اسمبلیوں کے لیے ٹکٹ دیے تھے لیکن کانگرس نے ہندو مُسلم سوال سے بلند ہو کر اپنے اُمیدوار

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بچے تھے جن میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی، سکھ اور عیسائی بھی، پارسی بھی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی۔

اس وقت ہندوستان جیسے ایک دن دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک کی صورت میں نقشۂ عالم پر نمودار ہونا تھا، پہلی بار جنرل الیکشن کے نام سے آشنا ہو رہا تھا۔

سارا ملک الیکشن کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ ایک دن اخبارات میں خبر آئی ——— جواہر لعل نہرو کانگرس کے اُمیدواروں کی حمایت میں ہوائی جہاز کے ذریعے سے سارے ملک کا دورہ کریں گے ——— جواہر لعل نہرو کا سارے ملک میں دورہ کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ ہمارے شہر راولپنڈی میں بھی آئیں گے۔ اگرچہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے ہندوستان کو ''صوبائی خود مختاری'' نام کا کھلونا دے دیا تھا لیکن دراصل ابھی تک جنگِ آزادی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ملک میں انگریز کے خلاف جو جذبہ ۱۹۳۵ء سے قبل تھا وہی ۱۹۳۵ء کے بعد بھی موجود تھا اس لیے اُس وقت تک آزادی کی جنگ لڑنے والے تمام رہنماؤں کے لیے اہلِ ہند کے دلوں میں محبت اور عقیدت کا عالم لفظ و بیان سے باہر تھا۔ سیاسی رہنماؤں کے ''درشن'' اس ذوق و شوق سے ہوتے تھے جیسے یہ کوئی دیوی دیوتا ہوں جو آسمان سے اُتر کر آئے ہیں اور ان دیوی دیوتاؤں میں مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، ماتا کستور با گاندھی، ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، سبھاش چندر بوس، شیخ محمد عبداللہ، اروناآصف علی، سردار پٹیل، جے پرکاش نرائن اور خان عبدالغفار خان ایسی شخصیتیں تھیں جن پر اہلِ ملک جان چھڑکتے تھے۔

میں اُس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے چکا تھا اور بی اے میں داخل ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ سولہ برس کی میری عمر تھی۔ اس عمر میں ہیرو ورشپ کا جذبہ بھی زوروں پر ہوتا ہے چنانچہ ہر روز میں فقط یہ جاننے کے لیے اخبار بڑی توجہ سے پڑھتا تھا کہ جواہر لعل نہرو کب راولپنڈی آ رہے ہیں۔ آخر ایک دن اُن کی راولپنڈی میں آمد کی اطلاع اخبارات میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

چھپ گئی۔ راولپنڈی کی کانگرس کمیٹی نے زور شور سے اُن کے استقبال کی تیاری شروع کردی۔ ہر روز لاؤڈ اسپیکر پر یہ اعلان ہوتا تھا کہ پنڈت جی کا طیارہ فلاں تاریخ کو چک لالہ کے ہوائی اڈے پر اُترے گا۔ سب لوگ جوق در جوق چک لالہ پہنچ کر اپنے محبوب رہنما کا استقبال کریں۔

پنڈت جی کا ہوائی جہاز غالباً دوپہر کو چک لالہ کے ہوائی اڈے پر اُترا لیکن راولپنڈی اور مضافات کے گوشے گوشے سے لوگ صبح سات آٹھ بجے ہی چک لالہ کے ہوائی اڈے پر پہنچنا شروع ہو گئے۔ جس طرف نگاہ جاتی تھی لوگوں کا سیلاب ایک ہی منزل کو رواں تھا ——— چک لالہ کا ہوائی اڈہ۔

دراصل اُس زمانے میں کسی قومی لیڈر کا ہوائی جہاز سے آنا اپنی جگہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ کیونکہ مُلک میں چند ہوائی جہاز تھے جو آسمان میں اُڑتے ہوئے کبھی کبھار ہم لوگوں کو نظر آجاتے تھے۔ گویا ہوائی جہاز ایک انتہائی نادر شے تھی اور جواہر لعل نہرو ہوائی جہاز میں راولپنڈی آرہے تھے۔ اس سے ہم لڑکوں کی حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا اور دلچسپی میں بھی ——— اور ساتھ ہی ساتھ ہم تمام طلبہ کی نظر میں ہوائی جہاز کا تصور جواہر لعل نہرو کی عظمت میں بھی اضافہ کر رہا تھا۔

اور حقیقتاً اُس وقت ہوائی جہاز بھی کیا ہوں گے کوئی ڈکوٹا کی طرح کا طیارہ ہوگا یا اس سے بھی کہنہ تر ماڈل جس میں کبھی وائسرائے یا گورنر یا کمانڈر انچیف آنکلتے ہوں گے۔ اس وقت ہوائی جہاز کا اور کوئی مصرف ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ایئر فورس نام کی تو مُلک میں کوئی شے تھی نہیں۔ اور طیارہ گاہ؟ جیسے طیارے ویسی ہی طیارہ گاہ' جیسی رُوح ویسے فرشتے۔ اندیشہ یہ تھا کہ نہ جانے وہ جسے ایئرپورٹ کہتے ہیں اُس پر یا اُس کے آس پاس ان ہزاروں افراد کے کھڑے ہونے کی جگہ بھی ہوگی جو راولپنڈی اور اس کے گردونواح سے ہزاروں کی تعداد میں طیارہ گاہ کو رواں دواں ہیں۔ گھر والوں نے روکا کہ اس بھیڑ میں کچلے جانے کا ڈر بھی ہے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اس لیے ہم چند لڑکوں نے ایر پورٹ کا رُخ تو نہ کیا لیکن قبل از وقت میونسپل باغ کو روانہ ہوئے جہاں انتخابی جلسے میں جواہر لعل نہرو کو تقریر کرنا تھا۔ (آج اُس باغ کو لیاقت باغ کہتے ہیں) وہاں پہنچے تو دیکھا کہ سارا باغ سامعین سے بھر چکا ہے۔ چنانچہ باغ کے باہر، بلکہ سڑک سے بھی ذرا ایک جگہ ہم سب کھڑے ہو گئے تاکہ دُور ہی سے سہی اس عظیم شخصیت کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔

ایک عمدہ بات اُس جلسے کی یہ تھی کہ وہ ڈائس جس پر کھڑے ہو کے پنڈت جی کو تقریر کرنا تھی بہت اُونچا تھا۔ اور ہمیں یقین تھا کہ جب پنڈت جی اس ڈائس پر کھڑے ہو کر تقریر کریں گے تو ہم اُنھیں باآسانی دیکھ سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پنڈت جی ہجوم میں گھرے ہوئے انقلاب زندہ باد، ٹوڈی بچہ ہائے ہائے، مہاتما گاندھی زندہ باد، جواہر لعل نہرو زندہ باد کے نعروں میں جلسہ گاہ میں پہنچے اور بجلی کی سُرعت سے ڈائس پر چڑھ گئے۔ بہت ہی تیز چلنا اُن کی شخصیت کا ایک خاص پہلو تھا۔ یہی بات بعد میں ہم لوگوں نے اندرا جی میں بھی دیکھی۔ اُن کے ساتھ پنجاب کے اور لیڈر بھی تھے۔ اِدھر اُدھر لوگ ڈائس کی طرف اشارے کر کے کہہ رہے تھے وہ ڈاکٹر ستیہ پال ہیں، وہ سیف الدین کچلو ہیں، وہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ہیں، وہ ماسٹر تارا سنگھ ہیں، وہ عطاءاللہ شاہ بخاری ہیں، وہ میاں افتخار الدین ہیں، وہ ملک لعل خان ہیں۔ یہ سب حضرات پنڈت جی کے ساتھ ڈائس پر بیٹھ گئے اور پنڈت جی نے تقریر شروع کی۔

تقریر کیا تھی ایک شعلہ، جوالہ تھا کہ بھڑک رہا تھا، ایک دریا تھا کہ ٹھاٹھیں مارتا جا رہا تھا۔ اِس وقت یہ تقریر چھپی ہوئی اخبارات اور بعض کتابوں میں مل جائے گی۔ مجھے اِس وقت تقریر کا متن یاد بھی کہاں ہے۔ ہاں ایک بات یاد ہے جس کی اہمیت کا اُس وقت مجھے اندازہ نہیں ہوا، بہت بعد میں اِس کی قدر و قیمت سے میں آشنا ہُوا۔

ڈائس پر دو جھنڈے لہرا رہے تھے ایک کانگرس کا اور ایک کانگرس سوشلسٹ پارٹی کا جو

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اُس وقت کانگرس ہی کا ایک حصّہ تھی۔ کانگرس کا ترنگا جھنڈا اُونچائی میں کم اور سوشلسٹ پارٹی کا سُرخ جھنڈا اُونچائی میں زیادہ تھا۔ پنڈت جی کی تقریر کے آخری الفاظ کچھ اس طرح کے تھے کہ ترنگا جھنڈا مُلک کا جھنڈا ہے، راشٹریہ کا جھنڈا ہے، ساری قوم کا جھنڈا ہے اور سُرخ جھنڈا ایک پارٹی کا جھنڈا ہے۔ اور اگرچہ یہ جھنڈا دُنیا بھر کے مزدوروں اور محنت کشوں کی نمائندگی کرتا ہے لیکن ہے پارٹی ہی کا جھنڈا اور اس کا مرتبہ مُلک اور راشٹریہ کے جھنڈے سے اُونچا نہیں ہوسکتا۔ یہ پنڈت جی کی پہلی جھلک تھی جو میں نے دُور سے دیکھی اور پہلی تقریر تھی جو میں نے سُنی۔

(۲)

اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک پنڈت جی کو دیکھنے یا سُننے کا اتفاق نہ ہوا۔ ہاں جب آزادی ملنے والی تھی تو انتقالِ اختیارات سے چند روز قبل ریڈیو سے اُن کی تقریر ضرور سُنی۔ اُس وقت تین تقریریں ہوئیں ایک پنڈت جی کی، دُوسری جناح صاحب کی اور تیسری سردار بلدیو سنگھ کی ——— لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ہم لوگ لُٹ لُٹا کر دہلی آ گئے تو ایک دن اعلان ہوا کہ آج شام کو فلاں وقت رام لیلا گراؤنڈ میں کانگرس کا جلسہ ہوگا جس میں پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا آزاد، سردار پٹیل اور دُوسرے قومی لیڈر تقریریں کریں گے۔ میں مزاجاً اس طرح کے سیاسی جلسوں سے دُور ہی رہتا ہوں لیکن میں اُن دنوں عرش ملسیانی کے گھر میں مقیم تھا۔ جلسے سے تھوڑی دیر قبل پنڈت ہری چند اختر آئے اور ہم دونوں کو اپنے ساتھ جلسہ گاہ میں لے گئے۔

دہلی میں فسادات تو ختم ہو چکے تھے لیکن مُسلم مہاجرین کا ہُمایوں کے قلعے اور دُوسرے کیمپوں میں جا کر پناہ لینے کا سلسلہ جاری تھا۔ پنڈت جی نے تو خود فساد زدہ علاقوں میں جا کر اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مُسلمانوں کو قتل ہونے سے بچایا تھا اس لیے اُن کی تقریر کا ہر لفظ اُن کے دِل سے نکل رہا تھا۔ وہ اپنی تقریر میں مغربی استعمار پرستوں پر حملے بھی کر رہے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تھے، مُسلمانوں کی ڈھارس بھی بندھا رہے تھے اور اُنھیں ہندوستان کو چھوڑ کر نہ جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ شرارت پسند عناصر پر آتشیں تقریر سے کوڑے بھی برسا رہے تھے۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر اُن کی تقریر سُن رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سُننے والوں پر ایک جادو کا عمل ہو گیا ہے۔ کیا مجال جو مجمعے میں کہیں سے بھی کوئی آواز آ رہی ہو۔ اسی عالم میں پنڈت جی نے اپنی تقریر ختم کی اور فوراً ہی کسی دُوسری مصروفیت کے پیشِ نظر وہاں سے چلے گئے۔ مولانا آزاد اس جلسے میں تشریف نہیں لائے تھے۔ پنڈت جی کے بعد سردار پٹیل نے تقریر کی۔ تقریر تو اُن کی بھی عمدہ تھی وہ بھی ایک باعمل لیڈر تھے، صرف گفتار کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ اُنھوں نے اپنی تقریر میں جموں و کشمیر کا بھی ذکر کیا اور پنڈت جی کی پالیسی سے اختلاف کا اظہار بھی کیا۔ لیکن ایک جملہ اُنھوں نے ایسا بھی کہا جو خاصا بے محل تھا اور وہ جملہ کچھ اس طرح کا تھا ——— میں مُسلمانوں سے بھی کہوں گا کہ وہ بھی اس مُلک کے شہری بن کر رہیں اور ان حرکتوں سے باز آ جائیں جن کے وہ اس وقت مرتکب ہو رہے ہیں ——— گویا اُنھوں نے 'ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں' کے مصداق ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو ایک ہی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی اور میں ایک طرف کھڑے ہوئے یہ تقریر سُن رہے تھے۔ اختر صاحب نے فوراً ہی ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہندوستان کے ہوم منسٹر کو اس طرح کی بات کہنا زیب نہیں دیتا۔ اُنھوں نے یہ بات کہہ کے غیر ذمّہ داری کا ثبوت دیا ہے اور اپنی حدُود سے تجاوز کیا ہے۔

تقریر کے اس حصّے پر دُوسرے دن اخبارات بالخصوص مُسلمانوں کے اخبارات میں اختلافی انداز کے تبصرے ہوئے مگر وہ دور ایسا نفسی نفسی کا دور تھا کہ تبصروں وغیرہ سے کیا ہوتا تھا۔ لیکن بڑی بات یہ تھی کہ ہندوستان میں جمہوریت روزِ اوّل سے اپنے قدم جما رہی تھی اور مُلک کے ہوم منسٹر کے خلاف یا کسی بھی منسٹر کے خلاف اخبارات کے تبصرے ہماری

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

معمول کی زندگی کا جزو بن رہے تھے اور جمہوریت کے ساتھ ہی ساتھ یہ طرزِ زیست بھی جواہر لعل نہرو کی دین تھی۔

(۳)

کچھ مدت کے بعد پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبۂ اُردو میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر میرا تقرر ہو گیا۔ جوش ملیح آبادی اس شعبے کے ایڈیٹر یا مدیر تھے اور ہم تین بلکہ چار اُن کے نائب مدیر تھے۔ عرش ملسیانی، ہری چند اختر، بلونت سنگھ اور راقم التحریر۔

اُس دور میں یعنی ۱۹۴۸ء کے شروع سے ۱۹۵۵ء کے آخر تک جوش صاحب کی بدولت پنڈت جواہر لعل نہرو سے خاصی ملاقاتیں رہیں۔ اگرچہ ان ملاقاتوں میں میری حیثیت محض ایک سامع کی ہوتی تھی لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ دُنیا کے اِتنے بڑے دانشور کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔

(۴)

اب میں آئندہ سطور میں شاید واقعات کی ترتیب برقرار نہ رکھ سکوں اور اِس روداد میں ترتیبِ واقعات کی زیادہ اہمیت بھی نہیں۔ زیادہ اہمیت اِس بات کی ہے کہ ممکن ہے اِس مقالے کے ذریعے سے پنڈت جی کی شخصیت کے بعض ایسے پہلو سامنے آجائیں جو ابھی تک اکثر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوں گے۔

میں یہ بات یہاں سے شروع کروں گا کہ جوش صاحب جب بھی چاہتے تھے انھیں پنڈت جی کے ساتھ ملاقات کے لیے وقت مل جاتا تھا۔ اور دو ایک بار تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ پنڈت جی جوش صاحب کے اِنتظار میں نیچے پورچ میں موجود ہیں۔

ہاں تو میں پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبۂ اُردو کا ذکر کر رہا تھا۔ انگریز کے دور میں اِس ادارے کا نام یونائیٹڈ پبلی کیشنز تھا اور آزادی کے بعد جب ادارے کو دوبارہ ایک فعال حیثیت دی گئی تو صرف اِس کا نام ہی نہیں بدلا گیا بلکہ ایک طرح سے اِس کا پُنر جنم ہوا۔ اِس

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ادارے کے تحت اُردو کے تین ماہنامے جاری ہوئے۔ ایک تو وہی پُرانا ''آج کل'' تھا جو شروع سے چلا آرہا تھا۔ دُوسرے دو تھے ''بساطِ عالم'' اور ''نونہال''۔ ''بساطِ عالم'' کا نائب مدیر میں تھا اور ''نونہال'' کے نائب مدیر تھے بلونت سنگھ۔ جب ''بساطِ عالم'' کے پہلے شمارے کی تیاری ہونے لگی تو میں نے جوش صاحب سے کہا کہ یہ ایک نیا جریدہ ہے۔ مناسب ہوگا اگر اس کے لیے پنڈت جواہر لعل نہرو کا پیغام ہمیں مل جائے۔ جوش صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا اور فوراً ہی اُنھوں نے پنڈت جی کو خط لکھ دیا۔ اب اس وقت جوش صاحب کے خط یا اس کی نقل تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن اس میں ایک جُملہ کچھ اس طرح کا تھا کہ اگر آپ نے ''بساطِ عالم'' کے لیے پیغام نہ بھیجا تو آپ کے ساتھ میری ایسی جنگ ہوگی جسے دُنیا کی کوئی یو۔این۔او ختم نہیں کر سکے گی۔ اس خط کے تیسرے دن پنڈت جی کی طرف سے جوش صاحب کو ایک بند لفافہ ملا جس میں مندرجہ ذیل پیغام ملفوف تھا:

> کچھ عرصے سے میں نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اخباروں اور رسالوں کو پیغام نہ بھیجا کروں۔ ایسے پیغاموں کی جتنی مانگ آتی ہے ان کا جواب دینے میں سارا کام رُک سکتا ہے۔ علاوہ اس کے اخباروں اور رسالوں کو رائے دینے سے پہلے ان کا امتحان ہونا چاہئے۔ پہلے سے رائے دینا کچھ مناسب نہیں معلوم دیتا۔
>
> لیکن میرے پُرانے دوست جوش ملیح آبادی نے اتنا اصرار کیا ہے، یہاں تک کہ ایک الٹی میٹم دیا ہے لہٰذا میرے لیے بالکل انکار کرنا مشکل ہوگا۔
>
> ظاہر ہے کہ جو رسالہ جوش صاحب نکال رہے ہیں وہ دلچسپ ہوگا اور شاعرانہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت لوگوں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کوئی دُنیا کے خیالات پہنچائے گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس
کام میں جوش صاحب کو کامیابی ہوگی۔

نئی دہلی　　جواہر لعل نہرو

۲۸ر جون ۱۹۴۸ء

یہ پیغام ''بساطِ عالم'' کے پہلے شمارے میں جو جولائی ۱۹۴۸ء میں منظرِ عام پر آیا' پنڈت جی کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا۔

یہ پیغام ہم لوگوں کو ملا تو سارے پبلی کیشنز ڈویژن میں اس بات کی دُھوم مچ گئی کہ پنڈت جی نے جوش صاحب کی فرمائش پر ''بساطِ عالم'' کے لیے پیغام بھیجا ہے۔ اور یہ اس لیے بھی بڑی بات تھی کہ پبلی کیشنز ڈویژن کی طرف سے ماہنامے اور دو ماہی جریدے تو اور بھی شائع ہو رہے تھے، انگریزی میں بھی اور ہندی میں بھی۔ مثلاً March of India اور Foreign Review (انگریزی) ''آج کل'' (ہندی) اور ''بال بھارتی'' (ہندی) لیکن یہ شرف تو صرف اُردو ہی کے ایک ماہنامے کو حاصل ہوا تھا۔ چونکہ ''بساطِ عالم'' کو مرتب کرنے کی ذمہ داری میری تھی اس لیے یہ پیغام جوش صاحب نے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اُسے کاتب کے حوالے کیا کہ اسے خوش خط لکھ دے۔

غالباً اس دوران میں عرش نے جوش صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ اس خط کا انگریزی ترجمہ کر کے ڈائرکٹر کو بھیجا جائے اور مجھے اُسی روز جوش صاحب کی طرف سے ایک پرچہ موصول ہوا جس پر لکھا تھا:

ترجمہ کر کے حرفِ مدعا کا
بھیج دیجے پیامِ نہرو کا

چنانچہ میں نے اس کا انگریزی ترجمہ کر کے جوش صاحب کو بھیج دیا۔ جوش صاحب نے یہ ترجمہ ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن کو بھیجا اور وہاں سے ڈپٹی سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری، سیکرٹری

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سے ہوتا ہوا اُس وقت کے وزیرِ اطلاعات ونشریات تک پہنچا اور منسٹری میں جوش صاحب کا ذکا جو پہلے ہی روز سے بج رہا تھا اور زور و شور سے بجنے لگا۔

(۵)

اب جوش صاحب ہی کے تعلق سے جواہر لعل نہرو کی زندگی کے کچھ واقعات بہ تسلسل یاد آ رہے ہیں۔ سوچتا ہوں پہلے اُنھی کا ذکر کر دوں کیونکہ اب کچھ صورتِ حال ایسی ہے کہ کوئی بات ایک بار حافظے سے نکل جائے تو بعض دفعہ دوبارہ وہ یاد ہی نہیں آتی۔

اُسی زمانے میں شیخ محمد عبداللہ مرحوم اور بخشی غلام محمد مرحوم نے ذاتی دلچسپی لے کر سری نگر میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اور اس مشاعرے کی صدارت پنڈت جواہر لعل نہرو نے کی۔ صدارت سے میری مُراد یہ نہیں ہے کہ وہ محض زینتِ مسند بن کر مشاعرے میں موجود رہے بلکہ نظامت بھی خود اُنھوں نے کی۔ فہرست اُن کے سامنے موجود تھی اور وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک شاعر کو زحمتِ کلام دیتے رہے۔ اس مشاعرے میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، روش صدیقی، معین احسن جذبی اور راقم الحروف نے شرکت کی۔ ہندی کے مشہور شاعر ہری دنش رائے بچن بھی اُن دنوں کشمیر کی سیر کو آئے ہوئے تھے وہ بھی شریکِ مشاعرہ ہوئے۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا کہ اُس میں کشمیر کے مقامی شعراء مدعو تھے یا نہیں لیکن کچھ خیال ایسا آ رہا ہے کہ غلام رسول نازکی اس مشاعرے میں شریک تھے۔

اس مشاعرے میں فراق صاحب، پنڈت جی سے قدرے دُور بیٹھے تھے اور جب کوئی شاعر کلام پڑھ رہا ہوتا تھا تو فراق صاحب اپنے پاس بیٹھے ہوئے شعراء کے ساتھ یا مہمانوں کے ساتھ باتیں شروع کر دیتے تھے۔ پنڈت جی تھوڑی دیر تو یہ منظر برداشت کرتے رہے لیکن دیکھ رہے تھے کہ فراق صاحب کی اس روش سے مشاعرہ خراب ہو رہا ہے۔ کہاں تک گوارا کرتے۔ جب ایک شاعر کلام پڑھ چکا تو پنڈت جی فراق صاحب

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سے مخاطب ہو کر بولے ''فراق صاحب! آپ کیوں مجھ سے اتنی دُور بیٹھے ہیں۔ آیئے یہاں میرے قریب آ جایئے۔'' فراق اُٹھے اور پنڈت جی کے قریب آ کے بیٹھ گئے اور ان کی زبان کو چُپ لگ گئی۔

اسی طرح اُنھوں نے چیمسفورڈ کلب نئی دہلی میں ایک انڈو پاک مشاعرے کی صدارت کی۔ کیا زمانہ تھا اور مشاعروں کے اِنتظام کا کتنا اُونچا معیار ہوتا تھا۔ بالخصوص چیمسفورڈ کلب کے مشاعرے کا اِنتظام تو ایک طرح سے شنکر پرشاد آئی سی ایس' ودیا شنکر آئی سی ایس' جوش ملیح آبادی اور کنور مہندر سنگھ بیدی ایسی مہتمم بالشان ہستیوں کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ خیر جمہوریت کے شجر کا پہلا پھل تو سیاسی آزادی ہے۔ جس مشاعرے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس کے منتظم خاص دہلی جن سنگھ کے لیڈر لالہ یودھراج تھے۔ اُنھوں نے مشاعرے کے لیے ایک خطیر رقم بھی مشاعرہ کمیٹی کو دی تھی۔ اُدھر جن سنگھ کے ورکروں نے فیصلہ کیا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے آج تک کسی ہندی کوی سمیلن کی صدارت تو کی نہیں۔ اُردو مشاعرے کی صدارت کیسے کر سکتے ہیں۔ اور مشاعرہ بھی وہ جس میں پاکستان سے شعراء آئے ہوئے ہیں۔ ہم یہ نہیں ہونے دیں گے اور ہم پکٹنگ کریں گے۔

چنانچہ اِدھر مشاعرہ شروع ہوا اُدھر کلب کے باہر جن سنگھ کے ورکروں نے مشاعرے کے خلاف نعرے لگانا شروع کیے۔ اِدھر سے چند منتظمین اُٹھے کہ پولیس سے کہہ کے اُنھیں رفع دفع کرا دیں لیکن پنڈت جی نے یہ کہہ کے روک دیا کہ نعرے لگانا تو ہر کسی کا حق ہے۔ ایجی ٹیشن کرنے والوں سے یہ جا کے کہہ دیجئے کہ جب شاعر کلام پڑھ رہا ہو تو نعرے نہ لگائیں۔ اور دو شاعروں کے درمیان جو وقفہ ہو اُس میں نعرے لگا لیا کریں۔ یہ مشورہ ڈائس پر بیٹھے ہوئے شعراء اور معززین کے لیے خاصی ہنسی کا سامان بن گیا۔

(۲)

مذکورہ بالا مشاعرہ سری نگر کے سلسلے کی ایک بات میں بھول گیا۔ اس کا ذکر چیمسفورڈ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کلب کے مشاعرے سے پہلے ہونا چاہئے تھا۔ خیر، مشاعرہ تو رات کو ہوا۔ اس سے قبل شام کو شیخ صاحب مرحوم نے نیڈوز ہوٹل میں پنڈت جی کے اعزاز میں ایک دعوتِ چائے کا اہتمام کیا۔ اس میں ہم تمام شعراء بھی مدعو تھے۔ ہم جب وہاں پہنچے تو ابھی پنڈت جی نہیں آئے تھے۔ ہم سب ایک میز کے اردگرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ جب پنڈت جی تشریف لائیں گے تو جوش صاحب سے ملنے اس میز کی طرف ضرور آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پنڈت جی جوش صاحب ہی کی خاطر ہماری میز کی طرف آئے۔ شیخ صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہم سب احتراماً اُٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ پنڈت جی نے شیخ محمد عبداللہ سے کہا شیخ صاحب، آپ نے جوش صاحب کے لیے سب انتظام کر دیا ہے یا نہیں۔ شیخ صاحب نے جواب دیا جی ہاں سب انتظام کر دیا گیا ہے۔ اس پر پنڈت جی نے کہا کہ وہ انتظام بھی کر دیا ہے یا میں دہلی سے کرا دوں۔ اس پر شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا جس کا مفہوم یہ تھا کہ انتظام کر دیا گیا ہے۔

اس ملاقات میں پنڈت جی جوش صاحب ہی سے باتیں کرتے رہے۔ اس صورتِ حال سے ساغر نظامی کو خاصی اُلجھن ہو رہی تھی۔ جوش صاحب نے یہ محسوس کر لیا اور پنڈت جی سے کہا کہ یہ ساغر صاحب ہیں۔ آپ نے شاید انھیں نہیں پہچانا۔ پنڈت جی نے کہا کہ ''خوب پہچانا ہے'' اس لفظ ''خوب'' کا بعض شعراء نے خاصا لطف لیا اور جب تک ہم لوگ سری نگر میں رہے نجی محفلوں میں اس جملے کی کہ ''خوب پہچانا ہے'' گردان ہوتی رہی۔

(۷)

ابھی تھوڑی دیر قبل میں نے فراق صاحب کا ذکر کیا ہے۔ اب فراق صاحب کی پنڈت جی سے ایک مُلاقات کی داستان بھی سُن لیجئے۔

یوں تو یہ کہانی اپنے پس منظر سمیت کافی طویل ہے اور اس کا ذکر میں تفصیل سے اُس مضمون میں کر رہا ہوں جو میں فراق صاحب کے متعلق ''مہمانِ عزیز'' کے زیرِ عنوان لکھ رہا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہوں لیکن چونکہ تمہید کا تعلق پنڈت جی کی ذات سے نہیں ہے اس لیے میں یہ واقعہ تمہید کے بغیر ہی عرض کرتا ہوں۔

دہلی میں فراق صاحب بالعموم ہمارے ہی غریب خانے پر قیام کیا کرتے تھے اور بعد میں جب میں سری نگر آ گیا تو بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ گھر میں پہلے ہی سے مہمان زیادہ تھے اور میں نے فراق صاحب کے قیام کا انتظام ٹورسٹ ریسپشن سنٹر میں کرا دیا۔ بہر طور جو واقعہ میں سنا رہا ہوں اس کا تعلق دہلی سے ہے۔ فراق صاحب نے الہ آباد سے میرے یہاں پہنچتے ہی فرمایا کہ پنڈت جی سے ملاقات کا وقت طے کرا دو۔ کچھ ضروری باتیں اُن سے کرنا ہیں۔

وقتِ ملاقات طے ہو گیا اور جب فراق صاحب اور راقم التحریر تین مورتی ہاؤس پہنچے تو پنڈت جی فراق صاحب کے انتظار میں نیچے برامدے میں موجود تھے۔ فراق صاحب کے ساتھ وہ بڑے تپاک سے ملے اور اُنھیں لے کے اُوپر کی منزل کی طرف چلے جہاں وہ رہتے تھے اور ملنے والوں سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ اب صُورت یہ تھی کہ زینے پر چڑھتے وقت آگے پنڈت جی تھے، اُن کے پیچھے فراق صاحب اور فراق صاحب کے پیچھے راقم التحریر۔ مذکورہ زینہ جہاں دائیں ہاتھ کو پہلا چکر کاٹتا ہے وہاں بائیں ہاتھ دیوار پر گاندھی جی کی تصویر آویزاں تھی۔ شاید اب بھی ہو۔ فراق صاحب جب اس تصویر کے پاس پہنچے تو پنڈت جی دو قدم آگے تھے۔ فراق نے تصویر کو دیکھتے ہی کہا: ''پنڈت جی!'' پنڈت جی رُک گئے اور مُڑ کے اُنھوں نے فراق صاحب کی طرف دیکھا کہ کچھ کہنا چاہتے ہوں گے۔ تو فراق نے چھوٹتے ہی کہا

''I can't stand ugliness even in Mahatma Gandhi.''

یہ جُملہ سُن کر میں تو سناٹے میں آ گیا کہ کس کے سامنے فراق نے ایسی بات کہہ دی۔ لیکن وہ عظیم شخصیت مسکرا دی اور ہم تینوں اُوپر کی منزل میں پہنچ گئے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اب وہاں باتیں شروع ہوئیں۔ میری حیثیت تو محض ایک سامع کی تھی اور میں تو فراق صاحب کے ساتھ ''منتھی'' ہو کے گیا تھا۔ پنڈت جی نے خیریت وغیرہ پوچھنے کے بعد فراق صاحب سے پوچھا'' آپ ابھی یونی ورسٹی میں ہیں نا؟''

فراق:- پنڈت جی' اگر یونی ورسٹی میں ہوتا تو آپ سے ملنے آتا؟''

پنڈت جی:- (دلکش مسکراہٹ کے ساتھ) ''فرمایئے میں اس سلسلے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ بلکہ آپ ہی بتایئے آپ کیا کام کرنا پسند کریں گے۔''

فراق:- دیکھئے پنڈت جی' کام وام تو میں بہت کر چکا۔ اگر کام ہی کرنا ہوتا تو آپ کے پاس کیوں آتا۔ ہاں کوئی sinecure job ہو تو مجھے دے دیجئے۔'' پنڈت جی اس پر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے'' اچھا میں مولانا صاحب سے بات کرتا ہوں۔ دہلی یونیورسٹی میں وہ شاید آپ کے لیے چیئر وغیرہ کا انتظام کر سکیں۔''

اس پر میں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں پنڈت جی نے فرمایا ''کہیے۔''

میں نے جواب دیا کہ ابھی مولانا صاحب نے جوش صاحب کے لیے دہلی یونیورسٹی میں چیئر قائم کی ہے۔ شاید دو شعراء کے لیے ایک ہی یونیورسٹی میں چیئر قائم کرنا ان کے لیے آسان نہ ہو بالخصوص جب دونوں چیئرز ایک ہی شعبے میں ہوں گی۔

پنڈت جی نے تھوڑی دیر کے لیے اس پر غور کیا اور پھر فرمایا کہ ٹھیک ہے میں اس سلسلے میں سردار پٹیل سے بات کروں گا۔ (اور راقم التحریر کا یہ خیال ہے کہ فراق صاحب کو چند ہفتوں کے بعد ریڈیو کا پروڈیوسر ایمرٹس بنا دیا گیا تو وہ غالباً اسی بات چیت کا نتیجہ تھا)

یہ بات ختم ہوئی تو فراق صاحب کہنے لگے:

''پنڈت جی ایک کام اور بھی ہے۔''

انھوں نے کہا'' فرمایئے۔'' بولے'' میرے ڈاک خانے کی پاس بک گم ہو گئی ہے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس میں روپیہ کتنا ہے۔" مجھے اُن کا یہ سوال سُن کے بڑی حیرت ہوئی کہ اپنی ملازمت کی حد تک تو بات ٹھیک تھی یہ ہندوستان کے وزیر اعظم کے ساتھ پاس بُک کا کیا بکھیڑا لے بیٹھے ہیں۔

پنڈت جی نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے پنڈت جی سے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کام کے لئے میں وِدیا شنکر صاحب سے کہہ سکتا ہوں۔ آپ کیوں زحمت کریں۔ پنڈت جی نے فرمایا ٹھیک ہے آپ ہی کہہ دیں میں بھی انھی سے کہتا۔

اس دوران میں چائے ہم پی چکے تھے۔ وقت بھی پندرہ بیس منٹ سے زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ میں نے فراق صاحب کو اجازت لینے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی کچھ اور بیٹھنا چاہتے تھے لیکن وزیر اعظم کے سیکرٹری اور میرے دوست لال صاحب آئی۔ سی۔ ایس پہلے ہی مجھ سے کہہ چکے تھے کہ پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہ لینا۔ وہ میرے ٹیلی فون ہی پر پنڈت جی کو میرے بارے میں بتا چکے تھے کہ فلاں کے فرزند ہیں، شاعر ہیں، فراق صاحب کے نیاز مند ہیں۔ فراق انھی کے وہاں ٹھہرے ہیں۔ پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر ہیں، وہ بھی فراق صاحب کے ساتھ آئیں گے۔ شاید اس formality کے بغیر میرا فراق صاحب کے ساتھ تین مورتی ہاؤس میں جانا ممکن ہی نہ ہوتا۔

(۸)

اپنے پریس انفارمیشن بیورو کے زمانے میں مجھے انفارمیشن آفیسر یا ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کے طور پر پنڈت جی کے ساتھ یا دوسرے لفظوں میں وزیر اعظم کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس مدت کا زیادہ حصہ میں انفارمیشن آفیسر کے طور پر انفارمیشن آفیسر اُردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ کچھ مدت ورکس اینڈ ہاؤسنگ منسٹری میں کام کیا، کچھ مدت ٹرانسپورٹ شپنگ اینڈ ٹورازم منسٹری میں اور ان سے کچھ زیادہ مدت ہوم منسٹری میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اور ہوم منسٹری کے بعد جب میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کے طور پر واپس پریس انفارمیشن بیورو میں آیا تو ٹیکنیکل سروسز کا کام میرے سپرد ہوا یعنی فوٹو ڈویژن اور اسی نوعیت کے دوسرے کام۔ اور یا پھر میں باہر سے آئے ہوئے مہمانانِ گرامی قدر کے دورانِ سفر ہند میں اُن کے ساتھ رہا۔ مثلاً شاہِ افغانستان کے ساتھ ایک بار اور شاہِ ایران کے ساتھ دو بار ہندوستان کے طول و عرض میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا اور شاہ اُردن کے ساتھ ایک بار۔ اس لیے پریس انفارمیشن بیورو میں مجھے پنڈت جی کو وزیرِ اعظم کے طور پر کام کرتے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ لیکن میرے جن رفقاء کو یہ موقع ملا اُن میں اکثر اُن کے متعلق جب کوئی بات سناتے تھے تو میں وہ غور سے سنتا تھا۔ مثلاً اندر پرتاپ تیواری جب پنڈت جی کے ساتھ اندرونِ ملک کے ایک سفر کے بعد واپس آئے تو میں نے اُن سے پوچھا کہ پنڈت جی کی عادات و اطوار کے بارے میں کچھ بتایئے تو اُنھوں نے کہا کہ رات کو جب کھانے کا وقت ہوتا تھا تو وہ جونیئر افسروں کے بارے میں بلا ناغہ پوچھا کرتے تھے کہ فلاں فلاں نے کھانا کھالیا یا نہیں اور جب اُنھیں اطمینان ہو جاتا تھا کہ ڈرائیور سمیت سب نے کھانا کھالیا ہے تو وہ اپنے ڈنر کے لیے بیٹھتے تھے۔

ایک دفعہ میرے یہ پوچھنے پر کہ پنڈت جی کی اتنی عمدہ صحت کا راز کیا ہے مجھے اپنے رفیقِ کار بلراج باوری نے یہ بتایا کہ پنڈت جی اُبلی ہوئی سبزیاں اور اُبلا ہوا گوشت استعمال کرتے ہیں اور شکر کا استعمال نہیں کرتے۔ میں نے یقین کر لیا اور میں نے بھی اُبلی ہوئی سبزیاں اور گوشت استعمال کرنا شروع کر دیا اور شکر کا استعمال ترک کر دیا۔ لیکن میں چند روز میں بیمار ہو گیا اور جب علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس گیا تو اُس نے دوبارہ شکر کا نارمل استعمال شروع کر دینے کی ہدایت دی۔ چند روز بعد میں ٹھیک ہو گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی لیکن اس کے کچھ دن بعد ایک ایسا واقعہ رُونما ہوا جس سے مجھے یہ پتہ چلا کہ باوری نے گپ ہانکی تھی اور اس بات کا کہ پنڈت جی مرغن کھانے یا شکر کا استعمال نہیں کرتے حقیقت

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ڈاکٹر سیّد محمود مرحوم مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی دُختر نیک اختر کی شادی تھی۔ مجھے بھی اُنھوں نے اس تقریب میں مدعو کیا اور ہوا یوں کہ کھانے کے وقت مجھے اُسی میز پر جگہ ملی جس پر پنڈت جی تشریف فرما تھے بلکہ میں اُن کے بالکل سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اُنھوں نے بلا تکلف مرغ مسلّم کا ایک چھوٹا سا حصّہ بھی لیا۔ کباب اور ذرا سا قورمہ وغیرہ بھی اور اس کے بعد بیٹھا بھی۔ تو گویا باؤری نے بالکل گپ اُڑائی تھی کہ وہ پرہیزی کھانا کھاتے ہیں۔

یہ کھانا Devicoes کے مالک نواب صاحب کی نگرانی میں جو اس فن کے ماہر تھے تیار ہوا تھا۔ نواب صاحب سے میرے دوستانہ مراسم تھے لیکن اب اُن کا اسمِ گرامی میں بھول گیا ہوں۔ یہ Devicoes ہوٹل بعد میں Standard کے نام سے چلتا رہا۔ اب بھی شاید Standard ہی کے نام سے چل رہا ہو۔ ریگل سنیما سے ملحق۔

اُس دعوت میں پنڈت جی کے بائیں طرف کوئی قومی نیتا تشریف فرما تھے۔ میں اُن سے واقف نہیں تھا۔ اُنھوں نے جھٹ ایک مرغ مسلّم اُٹھایا۔ اُسے اپنی پلیٹ میں رکھا اور چُھری لے کر اُس پر حملہ آور ہوئے۔ پنڈت جی نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا "اتنی تیزی نہ دکھاؤ یہ اُڑ نہیں جائے گا، تہذیب سے کھاؤ، مہذّب محفل میں بیٹھے ہو۔" معلوم نہیں وہ صاحب یہ تادیبی جُملے سُن کے جھینپے یا نہیں لیکن ساتھ بیٹھے ہوئے دُوسرے سب لوگوں نے پنڈت جی کے اِن جملوں کا خوب لطف اُٹھایا۔

اس دعوت میں صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی تشریف لائے تھے۔ وہ وِیجیٹیرین تھے۔ اُن کے کھانے کا اِنتظام کسی اور میز پر تھا۔ شروع میں پروٹوکول کے مطابق پہلے راشٹرپتی تشریف لائے اُن کے تھوڑی دیر بعد وزیرِ اعظم۔ اُن دونوں کو یکے بعد دیگرے ایک شامیانے میں لے جایا گیا جہاں شادی کی رسومات ادا ہو رہی تھی۔ میں اُس شامیانے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سے دُور تھا اس لیے شادی کی رسوم تو نہ دیکھ سکا لیکن بعد میں ہم لوگوں کو پتا چلا کہ نکاح نامے پر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لعل نہرو دونوں نے دستخط کیے ہیں۔ معلوم نہیں یہ بات صحیح تھی یا ویسے ہی کسی نے وہاں اُڑا دی تھی۔

(۹)

یہ مقالہ بر بنائے مصروفیت مختلف قسطوں میں لکھا جا رہا ہے اس لیے تمیں موورتی کے واقعات کو میں ایک جگہ جمع نہیں کر سکا ہوں۔ مخمور سعیدی صاحب کا حکم ہے کہ مقالہ اُنھیں جلد درکار ہے۔ اس لیے اب عبارت کو آگے پیچھے کرنے میں اندیشہ یہ ہے کہ سارا کام جہاں ہے وہیں نہ رہ جائے۔

تمیں موورتی کی دو ایک ملاقاتوں کا ذکر میں اُوپر کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ساہتیہ اکیڈیمی کا سالانہ جلسہ تھا۔ اس کے بعد ساہتیہ اکیڈیمی نے سپرو ہاؤس میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک جلسہ منعقد کیا اس میں جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری ایسے جلیل القدر شعراء اور دُوسرے اہلِ قلم حضرات صفِ سامعین میں موجود تھے۔ سامنے ڈائس پر پنڈت جواہر لعل نہرو اور ابوالکلام آزاد تشریف فرما تھے۔ غالباً صدارت ابوالکلام آزاد کر رہے تھے۔ تقریر صرف جواہر لعل نہرو کی تھی۔ پنڈت جی نے پہلے اُردو میں تقریر کی اس کے بعد انگریزی میں۔ دونوں کا موضوع معمولی سے فرق کے ساتھ قریب قریب ایک ہی تھا لیکن بعض باتیں اُردو تقریر میں نہیں تھیں اور بعض انگریزی تقریر میں نہیں تھیں۔ مثلاً ایک بات جو اُنھوں نے اُردو والی تقریر میں بڑے حسرت بھرے انداز میں کہی' یہ تھی کہ ایک وقت تھا میں بھی آپ ہی برادری کا ایک فرد تھا۔ میں لکھتا تھا اور ذوق و شوق سے لکھتا تھا۔ لیکن اس بات کو اب زمانہ ہو گیا ہے۔ اب تو مجھے لکھنے پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔[۱] سیاست ہے اور سرکاری نوعیت کے

---

[۱] یہ تو جہالت کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی ملک کا وزیر اعظم سوئی صد ایک ادیب کی زندگی تو بسر نہیں کر سکتا لیکن اُن کے قریبی احباب اور تمیں موورتی ہاؤس کے افسروں کی زبانی ہمیں یہ اکثر معلوم ہوتا رہتا تھا کہ پنڈت جی رات کو سونے سے قبل دو تین یا چار گھنٹے مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ (ج۔ن۔ا)

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کام۔ مجھے اس بات کا دُکھ ہے کہ میری زندگی کا ڈھانچہ بدل گیا ہے۔[1]

جوش صاحب صفِ سامعین میں موجود تھے۔ اُنھوں نے کھڑے ہو کے پنڈت جی کو اس فقرے پر ٹوکا اور کہا آپ نے اور مولانا آزاد نے خود ہی اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ آپ کو خدا نے علم و ادب میں اضافہ کرنے کے لیے پیدا کیا تھا آپ نے خود ہی وزارتوں کا بوجھ اپنے اُوپر لے لیا ہے۔ خود کردہ را علاج نیست۔ صرف یہی نہیں کہ آپ ہماری برادری کے افراد تھے بلکہ آپ اپنی جن وردیوں کو اُتار کر پھینک چکے ہیں وہ ابھی تک ہمارے پاس رکھی ہیں اور علم و ادب کے ساتھ آپ کی وفاداریوں کی داستان سنا رہی ہیں۔[2]

جوش صاحب کی اس ''مداخلت'' نے سارے ہال میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اُٹھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان قہقہوں میں پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد دونوں شریک تھے۔

دُوسری شام کو پنڈت جی نے اپنے گھر میں یعنی تین مورتی ہاؤس میں ہم شاعروں اور ادیبوں کو چائے کی دعوت دی۔ اُس روز فیض صاحب بھی دہلی میں تھے۔ وہ بھی اُس چائے میں مدعو تھے۔ Informal قسم کی چائے تھی۔ تین مورتی ہاؤس کے پیچھے کے لان میں سب چل پھر کے چائے پی رہے تھے۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر رادھا کرشن صدر جمہوریہ ہند تھے۔ لان میں تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ پنڈت جی نے خود فیض صاحب سے کلام سُنانے کی فرمائش کی۔ فیض نے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ نظم سنائی تھی جس میں ایک مصرع شاید اس طرح کا آتا ہے:

ع - اب تخت گرائے جائیں گے اب تاج اُچھالے جائیں گے

اب ماحول ہی ایسا تھا کہ صدر جمہوریہ، وزیرِ اعظم اور بعض دُوسرے وزراء کی

---

[1] پنڈت جی اور جوش صاحب کے یہ الفاظ تو اب میرے حافظے میں نہیں ہیں لیکن مفہوم ان کا یہی تھا۔ (ج۔ن۔ا)

[2] ایضاً

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

موجودگی نے غیر رسمی چائے کو بھی رسمی بنائے رکھا۔ فیض صاحب کی نظم ختم بھی ہوگئی، نہ کہیں سے آہ اُٹھی نہ واہ' نہ داد نہ فریاد' جیسے قبرستان میں اذان دے رہے ہوں۔

لیکن پنڈت جی اپنے گھر کی نشستوں میں اپنے بعض پسندیدہ اشعار پر کسی نہ کسی طرح سے پسندیدگی کا اظہار کر ہی دیا کرتے تھے۔ واہ واہ بھی کر دیتے تھے لیکن وہاں نہ جانے کیا بات تھی وہ بھی خاموش رہے اور دوسرے سارے سامعین بھی۔ اس وقت مجھے اُن کے گھر کی ایک نشست یاد آ رہی ہے۔ نشست تو یہ بھی گھر ہی کی تھی لیکن اس میں اور اُس میں فرق یہ تھا کہ یہ ایک بہت بڑے لان میں دعوتِ چائے تھی۔ کوئی دو سو کے قریب مہمان ہوں گے۔ جس نشست کا میں اب ذکر کر رہا ہوں وہ اُوپر کی اُس منزل میں منعقد ہوئی جس میں وہ فراق صاحب کو لے کے گئے تھے۔ یعنی جہاں وہ خود رہتے تھے۔ یہ فرشی نشست تھی۔ قالین کے اُوپر سفید چادر بچھی تھی۔ تکیے لگے تھے اور وہ صحیح معنوں میں اُردو شعر و سخن کی ایک نشست معلوم ہو رہی تھی۔ اب مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ کون کون سے شعراء اس نشست میں موجود تھے۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ہندوستان کے شعراء میں جوش تھے، فراق تھے، عرش تھے، ساغر تھے، راقم التحریر تھا۔ پاکستانی شعراء میں حفیظ جالندھری تھے، عبدالمجید سالک تھے اور سیّد محمد جعفری تھے۔ مہمانوں میں دہلی کے چیف کمشنر شنکر پرشاد صاحب تھے۔ افرادِ خانہ میں اندرا جی اور نہرو فیملی کی چند اور خواتین تھیں۔ باقی حضرات یاد نہیں آ رہے۔ شاید اور شعراء بھی ہوں' پوری طرح سے یاد نہیں آ رہا ہے۔ پہلے ہندوستانی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد پاکستانی شعراء نے۔ پاکستانی شعراء میں سب سے پہلے سیّد محمد جعفری مرحوم نے اپنی نظم پڑھی ——— اور پس منظر اس نظم کا یہ تھا کہ کچھ مدت پہلے پاکستان میں جنرل محمد ایوب خان برسرِ اقتدار آئے تھے۔ گویا جمہوریت کے بعد آمریت کا دور آیا تھا۔ جنرل ایوب خان نے آتے ہی مُلک کی اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ رشوت ستانی اور اسمگلنگ کے خلاف حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی تھی اور شروع شروع میں ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

یہ حکومت جمہوری حکومت سے کہیں بہتر ہے۔ انگلروں نے سمندر کی تہہ کے نیچے سونا چھپا رکھا تھا، نئی حکومت نے وہ سونا ڈھونڈ نکالا اور اُسے ضبط کر لیا۔ سیّد محمد جعفری کی نظم میں ایک مصرع کچھ اس طرح کا بھی تھا:

ع - بحر کی تہ میں جو سونا تھا نکلوایا گیا

یا شاید اس مفہوم کا اس سے بہتر مصرع تھا۔ ساری نظم بحیثیت مجموعی بہت عمدہ تھی لیکن پنڈت جی ایک مصرعے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا دُوسرے شعراء یا سامعین حضرات نے بھی اس نظم پر داد نہ دی۔ حالانکہ اس سے پہلے شعراء کو داد مل رہی تھی سامعین کی طرف سے بھی اور پنڈت جی کی طرف سے بھی اور بعد میں جب حفیظ صاحب نے اپنی غزل پڑھی تو اس میں اس شعر پر خاصی داد ملی ۔

برہمن نالۂ ناقوس مسجد تک بھی پہنچا دے
عجب کیا ہے مؤذن خواب سے بیدار ہو جائے

قبلہ سالک صاحب کے کلام پر محفل ختم ہوئی، چائے آئی۔ اندرا جی ایک ایک مہمان کی دیکھ بھال کر رہی تھیں لیکن اس کے باوجود پنڈت جی خود بھی تواضع کر رہے تھے۔ اگرچہ شعراء کے دل میں یہ خلش ایک سوال بن کر موجود تھی کہ سیّد محمد جعفری کی نظم پر سناٹا کیوں چھا گیا لیکن اس موضوع پر وہاں کوئی بات نہ ہوئی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ دو اڑھائی گھنٹے کی محفل کے بعد ہم سب لوگ اجازت طلب ہوئے اور تین مورتی ہاؤس کی گاڑیوں میں اپنے اپنے گھروں کو واپس پہنچے۔

دُوسرے دن حسب معمول جوش صاحب کے کمرے میں جب محفل جمی تو پنڈت جی کے گھر کی نشست بات چیت کا موضوع بنی۔ عرش نے سوال کیا کہ جوش صاحب، جعفری کی نظم پر پنڈت جی کیوں خاموش رہے حالانکہ ہر اعتبار سے وہاں نشست کا ماحول تھا۔ جوش صاحب نے کہا بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس پر جوش صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کہنے لگے آپ کا کیا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا ایک سبب میرے ذہن میں آ رہا ہے اور وہ یہ کہ جنرل محمد ایوب خاں جمہوری حکومت کو ختم کر کے فوجی آمریت کی حکومت کو برسرِ اقتدار لائے ہیں۔ اور یہ نظم اسی آمریت کی برسرِ اقتدار حکومت کی تعریف میں تھی گویا دوسرے لفظوں میں جمہوریت کے خلاف تھی۔ جوش میرے اس خیال سے متفق تھے لیکن عرش نے کہا کہ نہیں یہ سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ نظم میں جنرل محمد ایوب خاں کے اُن اقدامات کی تعریف کی گئی تھی جو اُنھوں نے چور بازاری، اسمگلنگ اور رشوت ستانی کے خلاف کیے تھے۔ گویا نظم میں اچھے اقدامات کی تعریف تھی۔

(۱۰)

اب جوش صاحب کی ایک نظم "ماتمِ آزادی" کا قصہ سُنیے۔ دراصل یہ قصہ بلکہ یہ واقعہ اگر آپ کنور مہندر سنگھ بیدی کی زبانی سُنیں تو صورتِ حال اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آ جائے گی کیونکہ میں نے بھی یہ واقعہ کنور صاحب ہی کی زبانی سُنا ہے۔ گویا میرے لیے یہ واقعہ شنیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، دیدہ کی نہیں۔ لیکن کنور صاحب کے لیے یہ محض دیدہ ہی کی نہیں آزمودہ کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔

جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ تھا لال قلعے میں، پنڈت جواہر لعل نہرو صدارت فرما رہے تھے، کنور صاحب نظامت کر رہے تھے۔ جوش نے اس میں اپنی نظم "ماتمِ آزادی" پڑھ ڈالی جس میں اس طرح کے اشعار اور بند آتے ہیں:

کھدر پہن پہن کے بد اطوار آ گئے
در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے

☆

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی　　چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمٰن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی　　گدی سے کھینچ لی گئی جو زباں تھی عوام کی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

حیوان بوکھلا گئے، منہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے

☆

وہ جو تمام راہزنوں کا امام ہے
وہ شخص آج خضر علیہ السلام ہے

☆

کل جن کی ڈپٹیوں کا نشانہ تھے رہنما
ان ڈپٹیوں کو ہم نے کلکٹر بنا دیا

☆

حکام مجرموں کے ہیں دامن سیے ہوئے   سی آئی ڈی ہے بادۂ غفلت پیے ہوئے
داروغہ جی ہیں قول بدوں کو دیے ہوئے   چوروں سے کوتوال ہے سازش کیے ہوئے
برٹش کے خادموں کو اچھالے ہوئے ہیں ہم
سانپوں کو آستین میں پالے ہوئے ہیں ہم

☆

برطانیہ کے خاص غلامانِ خانہ زاد   دیتے تھے انجیوں سے جو حبِ وطن کی داد
جن کی ہر ایک ضرب بجا تھی سروں کو یاد   وہ آئی سی ایس اب بھی ہیں خوش وقت و بامراد
شیطان ایک رات میں انسان بن گئے
جتنے نمک حرام تھے کپتان بن گئے

☆

وحشت روا، عناد روا، دشمنی روا   ہلچل روا، خروش روا، سنسنی روا
رشوت روا، فساد روا، رہزنی روا   القصہ ہر وہ شے کہ ہے ناکردنی روا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

انسان کے لہو کو پیو اذنِ عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے

اور آخری بند اس طویل مسدس کا یہ تھا:

وہ تازہ انقلاب ہُوا آگ پر سوار وہ سنسنائی آنچ وہ اُڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ، وہ غلطاں ہوا غبار اے بے خبر وہ آگ لگی آگ، ہوشیار
بڑھتا ہُوا فضا پہ قدم مارتا ہُوا
بھونچال آ رہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

یہ تصویر اب یوں بنتی ہے کہ جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ ہو رہا ہے، وہ بھی لال قلعے میں، ہندوستان کا وزیرِ اعظم اس کی صدارت کر رہا ہے۔ دہلی کا سٹی مجسٹریٹ اس مشاعرے کی نظامت پر مامور ہے اور جوش صاحب کہہ رہے ہیں:

کھدر پہن پہن کے بدا طوار آ گئے
در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے

اب جوش صاحب جب ٹھاٹھیں مارتے ہُوئے دریا کی طرح نظم پڑھنے میں مصروف ہیں۔ مجمع بے اختیار ہو کر ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرعے پر بے تحاشا داد دے رہا ہے۔ خود جواہر لعل نہرو بڑے اشتیاق سے یہ نظم سُن رہے ہیں تو کنور صاحب انھیں روکیں بھی تو کیسے۔ لیکن انھیں یہ تو محسوس ہو رہا ہو گا کہ نظم غلط مقام پر پڑھی جا رہی ہے ——— ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ لیکن جوش صاحب ان باتوں کی کہاں پروا کرتے تھے۔ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس وقت ایک ذمہ دار سٹی مجسٹریٹ کے دل کی کیا حالت ہو رہی ہو گی۔ بہر طور نظم ختم ہوئی اور جوش صاحب چونکہ اس مشاعرے کے آخری شاعر تھے، مشاعرہ ختم ہوا۔

دوسری صبح کنور صاحب نے جوش صاحب سے دوستانہ شکوہ کیا اور از راہِ مزاح یہ کہا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کہ جوش صاحب آپ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن اب میری شامت ہو جائے گی۔ بہر طور دونوں میں ہنسی مذاق کی باتیں چلتی رہیں کہ اُسی دن یا دوسرے دن پنڈت جی کی طرف سے جوش صاحب اور کنور صاحب کے نام فرمائش آئی کہ آپ دونوں حضرات میرے یہاں تشریف لائیے۔ جوش صاحب کے نام پیغام میں یہ بات بھی تھی کہ آپ نے لال قلعے کے مشاعرے میں جو نظم پڑھی تھی وہ بھی ساتھ لائیں۔

کنور صاحب کہتے ہیں کہ اب تو بڑی حد تک یقین ہو گیا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے لیکن جب دونوں تین مورتی ہاؤس میں پہنچتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ محفل سجی ہے۔ پنڈت جی کے علاوہ اندرا جی اور نہرو خاندان کے بعض اور اراکین، اور پنڈت جی کے بعض قریبی احباب وہاں جمع ہیں اور جوش صاحب کا انتظار ہو رہا ہے۔

پنڈت جی نے دونوں کو عزت سے بٹھایا اور جوش صاحب سے فرمائش کی کہ نظم ''ماتم آزادی'' ارشاد فرمائیں کیونکہ یہ تمام حضرات جو کل رات کے مشاعرے میں نہیں تھے نظم سننے کے آرزومند ہیں۔ چنانچہ جوش صاحب نے داد و تحسین کے شور میں وہ نظم پھر وہاں سنائی۔

کنور صاحب بیان کرتے ہیں کہ یہ نقشہ دیکھ کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اندیشہ تو یہ تھا کہ شاید باز پرس ہو گی کہ جشنِ جمہوریت کے مشاعرے میں یہ نظم پڑھنے کی کیا تُک تھی لیکن وہاں تو نقشہ ہی اور تھا۔

یہ تھے ہندوستان کے وزیرِ اعظم جو شعر و ادب کی قدر کرنا بھی جانتے تھے، تہذیب و تمدن کے مفہوم و اسرار سے بھی آگاہ تھے اور شاعری کے مزاج سے بھی آشنا تھے اور اس راز سے بھی کہ بلند پایہ اصلاحی شاعری اگر طنز و مزاح کا پہلو لیے ہوئے ہو تو وہ کتنی مؤثر ہو جاتی ہے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اس تحریر میں جوش صاحب اور فراق صاحب کی ملاقاتوں نے بہت جگہ گھیر لی ——— لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ——— اور دو ایک ایسی اہم باتیں رہ گئیں جو جواہر لعل نہرو کے نظریہ زباں اور نظریہ تعلیم پر روشنی ڈالتی ہیں۔

تعلیم اور بالخصوص بچوں کی تعلیم کے متعلق اُن کا زاویہ نگاہ اُن کی ایک ذرا سی بات سے میرے سامنے آیا۔ جب والدِ محترم کی بچوں کے لیے دو کتابیں ''بہارِ طفلی'' اور ''بچوں کی نظمیں'' شائع ہوئیں تو میں نے اُن سے کہا کہ یہ دونوں کتابیں آپ پنڈت جی کو پیش کیجئے۔ چنانچہ پنڈت جی سے وقتِ ملاقات اور مقامِ ملاقات دونوں طے ہو گئے۔ مقامِ ملاقات اُن کا دفتر تھا۔ سیکرٹریٹ میں نارتھ بلاک۔ والدِ محترم اور میں، ہم دونوں وقتِ ملاقات پر پہنچے۔ ذرا سی بات چیت کے بعد والدِ محترم نے کتابیں پیش کیں۔ پنڈت جی بلا مبالغہ کوئی دس منٹ تک دونوں کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔ متن کے بعد دیباچوں کے صفحات پر نظر ڈالی اور کہنے لگے مخدوم صاحب، کتابیں بچوں کے لیے ہیں لیکن شروع کے صفحات کی کتابت بہت باریک قلم سے کی گئی ہے۔ والد صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کی کتابت وطباعت کا سارا کام آزاد کی نگرانی میں ہوا ہے۔ خود میں نے اس بات کا خیال نہیں کیا۔ میں نے جواب میں یہ عرض کیا کہ نظموں کی کتابت تو جلی قلم سے ہے کہ یہ بچوں کے لیے ہیں۔ ہاں دیباچوں کی کتابت خفی قلم سے ہے کیونکہ دونوں کتابوں کے دیباچے بچوں کے لیے نہیں ہیں بلکہ اساتذہ کے لیے ہیں۔ فرمانے لگے یہ بات صحیح ہے لیکن ہو سکتا ہے کوئی دانش مند لڑکا ایک نظر دیباچے پر بھی ڈالنا چاہے لیکن وہ دیباچے کو اس قدر باریک قلم سے لکھا ہوا دیکھ کر ان صفحات سے بیزار ہو جائے گا۔ ہونا یہ چاہئے کہ بچوں کی کتاب اوّل سے آخر تک ظاہری دلکشی سے بھی معمور ہو۔ ان کتابوں کا حصہ نظم خوب صورت اور دلکش انداز سے چھپا ہے لیکن دیباچے والے حصے میں وہ بات نہیں۔

میں بچوں کی کتابوں کے متعلق اُن کے یہ الفاظ سُن کے حیرت زدہ رہ گیا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

جب ہم چلنے لگے تو حسب معمول پنڈت جی اُٹھے اور والد صاحب کے ساتھ دروازے تک چلنے لگے تو والد نے بہت روکا اور کہا کہ آپ تشریف رکھیے لیکن اُنھوں نے کہا ''تاحدِ باب'' اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے چیمبر کے دروازے تک اُنھیں پہنچانے آئے۔ اُن کی زبان سے ''تاحدِ باب'' سُن کر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ اُردو کو محض ایک زبان نہیں بلکہ تہذیب اور کلچر سمجھتے ہیں۔ اس موقعے پر مجھے اُن کے والدِ محترم موتی لال نہرو یاد آئے جو اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے ماہر تھے۔

۱۹۶۲ء کی بات ہے پریس انفارمیشن کی جانب سے نئی دہلی کے وگیان بھون میں ایک ''اُردو نمائش'' منعقد ہوئی۔ اس اُردو نمائش کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے جن حضرات نے یہ نمائش وگیان بھون میں دیکھی ہے وہ اس کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں گے۔ اس کا افتتاح پنڈت جواہر لعل نہرو ہی نے کیا۔

اُنھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں اہلِ قلم حضرات کو یہ تلقین کی کہ ادیبوں اور شاعروں کی زبان عوام کی زبان کے قریب ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں اُنھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی مثال دی۔ افتتاحی تقریر جب ختم ہوئی تو میں طے شدہ پروگرام کے مطابق اُنھیں نمائش گاہ کا ایک ایک پینل دکھانے لے گیا۔ جب وہ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے پینل کے سامنے پہنچے تو کافی دیر تک اِن کے blow-ups کو دیکھتے رہے۔ اس دوران میں اُن سے میں نے کہا کہ آپ نے فرمایا ہے ادیبوں اور شاعروں کی زبان عوام کی زبان کے قریب ہونا چاہئے لیکن مولانا کی زبان تو ایسی نہیں تھی اور علمی اور ادبی دنیا میں اُنھیں ایک قابلِ رشک مقام حاصل ہے۔ فرمانے لگے میں نے اُس ادب کی بات نہیں کی جو اِس وقت تک اُردو میں پیدا ہو چکا ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ آپ آج کے حالات کی نبض پر اُنگلی رکھیں اور ایسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کریں جسے ہندوستان کے عوام اپنی زبان سمجھیں۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

دہلی میں ۱۹۵۵ء کے بعد ایک مدت تک میرا قیام موتی باغ میں رہا۔ اور روزانہ گھر سے دفتر یعنی آکاش وانی بھون یا شاستری بھون جاتے ہوئے تین مورتی ہاؤس کے آگے سے گزرنا ہوتا تھا۔

۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کا دن تھا ہم چار دوست اور رفقائے کار یعنی اندر پرتاپ تیواری، (جن کا ذکر اس مقالے میں پہلے آچکا ہے) اُمیش تیواری اور مدن گوپال ("پریم چند: قلم کا مزدور" کے مصنف) اُمیش تیواری کی گاڑی میں گھر سے دفتر جا رہے تھے۔ ہم چاروں دوست موتی باغ میں رہتے تھے اور پریس انفارمیشن بیورو میں کام کرتے تھے۔ ابھی ہم نے تین مورتی سے ہو کے راشٹر پتی بھون والی سڑک کا رُخ کیا ہی تھا کہ سامنے سے دو ایمبولینس کاریں، جن میں چند نرسیں اور ڈاکٹر سوار تھے، ہمارے پاس سے گزریں اور تین مورتی ہاؤس میں داخل ہو گئیں۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ یہاں تین مورتی ہاؤس میں کوئی بیمار ہو گیا ہو گا۔ یہ ڈاکٹر اور نرسیں اسی لیے جا رہی ہیں۔ دوسرے نے کہا ہاں حکومت کا کوئی اہم مہمان یہاں ٹھہرا ہوا ہو گا۔ ہم میں سے کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ ہو سکتا ہے پنڈت جی ہی بیمار ہو گئے ہوں۔ کوئی دو تین منٹ میں ہم اپنے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہاں کسی کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ تین مورتی ہاؤس میں کوئی بیمار ہو گیا ہے اور دو ایمبولینس کاریں ڈاکٹروں اور نرسوں کو لے کر وہاں پہنچ چکی ہیں۔ تھوڑی دیر میں بیورو میں اطلاع ملی کہ پنڈت جی کی طبیعت خراب ہے اور کوئی ایک آدھ گھنٹے میں یہ خبر آگئی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس جہانِ فانی سے رُخصت ہو گئے ہیں۔

اللہ تیری ذات بڑی بے نیاز ہے!

ہم لوگوں پر تو گویا بجلی سی گری۔ لیکن پریس انفارمیشن بیورو کو ایسے موقعوں پر اور زیادہ فعال ہو جانا پڑتا ہے۔ فوراً پرنسپل انفارمیشن آفیسر نے ہمیں اپنے کمرے میں بلایا اور ہدایت دی کہ وزیرِ اعظم کے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کے سوا کوئی افسر تین مورتی ہاؤس کی طرف

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نہ جائے۔ ہاں اپنی اپنی وزارتوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں جن کے ساتھ کسی وزارت کی پبلسٹی کا کام نہیں ہے وہ اپنے اپنے کمرے میں موجود رہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ان سب کو ان کی ڈیوٹی سے آگاہ کر دیا جائے گا۔

کوئی ایک گھنٹے میں ڈیوٹی لسٹ آ گئی۔ میری ڈیوٹی یہ مقرر ہوئی تھی کہ کل میں فارن پریس کو لے کر راج گھاٹ پہنچوں گا جہاں پنڈت جی کا انتم سنسکار ہو گا۔

اس دوران میں اُن کے جسدِ خاکی کو عام درشنوں کے لیے تین مورتی ہاؤس ہی میں پھولوں کی سیج پر لٹا دیا گیا۔ شام کو ہم لوگوں نے جا کے اُن کے آخری درشن کیے اور دُوسری صبح میں غیر ملکی پریس کے نمائندوں کو ایک ڈی لکس بس میں لے کر راج گھاٹ کو روانہ ہوا۔

ارتھی کے پیچھے پیچھے بلکہ آگے اور دائیں بائیں بھی ہجوم کا اندازہ کرنا دُشوار تھا۔ پولیس کے انتظام کے باوجود صورتِ حال یہ تھی کہ اکثر معزز مہمانوں کو اپنی کاریں سڑک ہی کے کنارے یا درمیان میں ہجوم کے رحم و کرم پر چھوڑ کر سفر کا خاصہ حصہ پیدل طے کرنا پڑا۔ راج گھاٹ سے ڈیڑھ فرلانگ اِدھر میں نے دیکھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور بخشی غلام محمد بھیڑ میں دھکّے کھاتے ہوئے راج گھاٹ کو جا رہے ہیں۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم کا ہیلی کاپٹر جمنا کے دُوسرے کنارے پر اُترا اور وہاں سے وہ کشتی کے ذریعے راج گھاٹ تک پہنچے۔

میں جس بس میں فارن پریس کو لے کے جا رہا تھا اُس کا عین چتا کے قریب پہنچنا ضروری تھا کہ اُس میں غیر ملکی اخبارات کے نمائندے تھے اور یہ ساری رسومات بہت قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ بس بھیڑ کی وجہ سے کبھی رُکتی اور کبھی چلتی تھی اور وہ بھی چیونٹی کی رفتار سے۔ آخر کار ہم لوگ تمام رکاوٹوں کے باوجود اُس جگہ کے قریب پہنچ ہی گئے جہاں چتا بنی تھی۔ ارتھی وہاں رکھی جا چکی تھی اور ارتھی کے پاس ہی میں نے شیخ محمد عبداللہ، وجے لکشمی پنڈت، کرشنا ہتھی سنگھ، اندرا جی، راجیو اور سنجے کو دیکھا۔ اندرا جی نے جب

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

پنڈت جی کی لاش کے ماتھے کو چوما اور کہا Good bye papa تو قریب کھڑے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بڑا دردناک منظر تھا۔ سچ پوچھئے تو یہ سارا منظر دیکھنے کی تاب مجھ میں نہ تھی۔ اگر فرائضِ منصبی کی مجبوری نہ ہوتی تو میں وہاں رُک نہیں سکتا تھا۔ پولیس کے انتظام کی وجہ سے چتا کے بالکل قریب بہت کم لوگ ہی پہنچ سکے تھے۔ ادھر ہجوم میں اکثر لوگ تو دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔ بعض ایک دُوسرے کو سہارا دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارا ملک ایک خاندان ہے اور بزرگ خاندان رُخصت ہو گیا ہے۔

تمام رسُومات جب مکمل ہو گئیں تو میں اُسی طرح غیر ملکی پریس کو وہاں سے بین الاقوامی تار گھر میں لایا جہاں اُنھوں نے اپنے اپنے اخبارات کو Cables بھیجنا شروع کیے۔ میں اُن سے اجازت طلب ہوا اور میری زبان پر اُس وقت یہ اشعار تھے۔

اِس وقت جب کہ ہوں تری جلتی چتا کے پاس
میں اپنے ہوش میں ہُوں نہیں گم میرے حواس

کوئی نہ اب ہے یاس کا عالم نہ کوئی آس
اِک تشنگی ہے رُوح تو آنکھیں ہیں ایک پیاس

''تیری خبر ہے اور نہ اپنی خبر مجھے
آنکھیں ہیں اور کچھ نہیں آتا نظر مجھے''

جب ایک پل میں راکھ ہوا تیرا جسمِ پاک
لاکھوں تھے اشک بار کروڑوں تھے سینہ چاک

گردوں سے بھی بلند ترا ایک مشتِ خاک
اے عزمِ تند شعلہ و اے فکرِ تابناک

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ایسے مری نظر میں ترا شوقِ دید تھا
گویا نظر نہیں تھی دلِ نا اُمید تھا

جب راکھ ہو کے تیرا بدن خاک میں ملا
محسوس یوں ہوا کہ چمن خاک میں ملا

رفعت سے گر کے تاجِ وطن خاک میں ملا
سارا جمالِ گنگ و جمن خاک میں ملا

اے خاکِ ہند آج بس اتنا خیال کر
محسن کی راکھ ہے اسے رکھنا سنبھال کر

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

مولانا وقار انبالوی

(کچھ یادیں: کچھ باتیں)

عزیز محترم عطاالحق قاسمی صاحب' آداب

بہت دن ہوئے ''نوائے وقت'' میں مولانا وقار انبالوی کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔ اس کے بعد بھی ''نوائے وقت'' میں اکثر اُن کا ذکر دیکھنے میں آجاتا ہے۔ آپ بہت اچھا کر رہے ہیں کہ ''نوائے وقت'' کے ذریعے سے اُن کی یاد برقرار رکھے چلے آرہے ہیں۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

دراصل جب ''نوائے وقت'' سے اُن کی ریٹائرمنٹ کی اطلاع میری نظر سے گزری تھی تو میں اُسی وقت اُن کے متعلق ایک مضمون لکھنا چاہتا تھا۔ فرصت نہ ملی، پھر اُن کے انتقال پُر ملال کی خبر آئی۔ اُس وقت بھی لکھنے کا ارادہ کیا لیکن مکروہات دنیوی نے مہلت نہ دی۔ اب ۷ر جولائی ۱۹۸۸ء کے ''نوائے وقت'' میں' جو مجھے تین چار روز قبل ملا ہے مرحوم کے بارے میں انور داؤدی کا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

چھوٹا سا کالم دیکھا تو خیال آیا کہ میں بھی اس سلسلے میں کچھ لکھ کر آپ کو بھیجوں۔

پہلی بات تو اس سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ وقار صاحب کے پہلے تخلص کے متعلق انور داؤدی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ "عاضف مہرتوی" کہلاتے تھے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اُن کا پہلا تخلص "عاضف ملانوی" تھا۔ عاضف تخلص اور ملانوی اس لئے کہ ملانہ اُن کے گاؤں کا نام تھا۔ یہ گاؤں انبالے کے قریب ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی، وقار صاحب کی شاعری کے مداح تھے۔ لیکن "عاضف ملانوی" ایسے کرخت تخلص پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ان سے پوچھا کہ عاضف صاحب ملانہ کے نزدیک کوئی معروف شہر نہیں ہے؟" عاضف صاحب نے کہا "ہے تو سہی، انبالہ، آپ تو جانتے ہیں۔" تو مولانا نے فوراً کہا "تو پھر ملانوی کیوں بنے پھرتے ہو۔ انبالوی کہو اور یہ تخلص بھی بدل دو۔ آج سے تمہارا تخلص وقار انبالوی ہے۔" عاضف صاحب کو بھی یہ تخلص پسند آیا اور وہ اُس روز سے وقار انبالوی بن گئے۔

میں ۱۹۳۷ء میں لاہور آیا لیکن یہ میرے لاہور آنے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اس بات کا ذکر خود مجھ سے اُستادِ محترم مولانا تاجور نجیب آبادی نے کیا تھا۔ بعد میں وقار صاحب نے خود اس کی تائید کی۔ انور داؤدی صاحب کی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روزنامہ "ملاپ" کی ملازمت چھوڑ کر وقار صاحب "احسان" کے مدیر مقرر ہوئے۔ دراصل ان کا روزنامہ "ملاپ" کا دورِ ملازمت بہت پہلے کی بات ہے۔ جب روزنامہ "احسان" سے اُنھیں مدیر بننے کی پیش کش ہوئی تو وقار صاحب روزنامہ "پرتاپ" میں ملازم تھے اور اس بات کی تائید والدِ محترم کی اس رُباعی سے بھی ہوتی ہے:

جس دن سے اُدھر سے تُو اِدھر آیا ہے
چشمِ بینا کو کم نظر آیا ہے

"احساں" پہ بھی احساں تھا ضروری لیکن
"پرتاپ" کو بے وقار کر آیا ہے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میرے اور وقار صاحب کے مراسم ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اس طرح کے رہے کہ ہر روز نہیں تو ہفتے میں چار پانچ چھے روز ضرور اُن سے ملنا ہوتا تھا۔ میرے اُن کے دوستانہ مراسم نہیں تھے۔ دوست تو وہ میرے والدِ محترم کے تھے۔ میں اُن کا نیاز مند تھا، اُن کی بدیہہ گوئی کا عاشق تھا، اور اُن کی گفتگو کا جس میں عالمانہ شان، ادبی مرتبہ، ضلع جگت، فقرہ بازی سب کچھ شامل تھا۔ اگرچہ میرا اُن کا رشتہ خوردی بزرگی کا تھا لیکن وہ بے تکلفانہ گفتگو کے دوران میں فحش گوئی سے بھی نہیں چُوکتے تھے اور برجستہ جملہ کہنا تو آپ جانتے ہیں آخر تک اُن کے مزاج کا جزو رہا۔

آپ کو یاد ہوگا ۱۹۸۳ء میں دُوسری اقبال عالمی کانگریس کے بعد جب آپ اور نواب زادہ عبدالغفور خاں صاحب مجھے واہگہ تک پہنچانے آ رہے تھے اور ابھی ہمارے پاس کچھ وقت تھا تو میں نے کہا کہ ممکن ہو تو مجید نظامی صاحب اور وقار انبالوی صاحب سے ملتے چلیں چنانچہ ہم تینوں ''نوائے وقت'' کے دفتر میں پہنچے اور مجید نظامی صاحب سے ملنے کے بعد وقار صاحب کے کمرے میں گئے تو اُن کے اس جملے کے بعد ''یہ تو میرا بھتیجا آ گیا ہے'' جب میں نے اُن کی خیریت پوچھی تو آپ نے اُن کے بارے میں یہ بتایا کہ مولانا ہر روز بس میں اپنے گاؤں سے آتے ہیں۔ روزانہ ''سرراہے'' کا کالم اور ایک قطعہ لکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ''مولانا ہر طرح سے فِٹ ہیں'' تو اُن کا جواب یہ تھا کہ

''فِٹ ہونے کے معنی تو یہی ہیں کہ انسان ہر طرح سے فِٹ ہو اور اگر ہر طرح سے فِٹ نہ ہو تو فِٹے منہ۔''

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں وقار انبالوی کے نام اور کلام سے ۱۹۳۴ء میں واقف ہوا۔ اُس زمانے میں مہاشے سدرشن ''چندن'' نام کا ایک ماہنامہ نکالتے تھے اور یہ ماہنامہ سدرشن صاحب کے افسانوں اور سلسلہ وار ناولوں کی اشاعت کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ وقار انبالوی کا کلام اس میں شائع ہوتا تھا۔ اُن کے کلام کے ساتھ میرا اوّلین تعارف اسی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

''چندن'' کی بدولت ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے وقار صاحب کچھ مدت اس رسالے کے نائب مدیر بھی رہے اور نائب مدیر کے طور پر اُن کا نام بھی اس پر چھپتا تھا۔

ساتھ ہی وقار انبالوی اُس زمانے میں کویراج ہرنام داس بی اے کی کتاب ''ہدایت نامہ خاوند'' کو منظوم کر رہے تھے اور یہ منظوم کلام سلسلہ وار کویراج جی کے ماہنامہ ''علم و عمل'' میں باقاعدگی سے شائع ہو رہا تھا۔ یہ ایک مثنوی تھی اور بحر ہزج مثمن سالم میں تھی یعنی حفیظ جالندھری کے ''شاہنامہ اسلام'' کی بحر میں۔ تو گویا وقار صاحب اپنی بدیہہ گوئی کو پوری طرح استعمال کر رہے تھے اور بدیہہ گوئی کا جہاں تک تعلق ہے پنجاب میں دو شعراء کا نام اُس وقت چمک رہا تھا۔ ایک مولانا ظفر علی خاں اور دُوسرے وقار انبالوی۔ شورش کاشمیری کی اُٹھان سے بھی گمان یہ ہوتا تھا کہ بدیہہ گوئی میں یہ بھی اپنا جواب آپ ہی ہوں گے۔ میں اس وقت تک رئیس امروہوی کے نام اور کلام سے ناواقف تھا ورنہ زود گو شعراء کی فہرست رئیس امروہوی کے نام کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔

کویراج ہرنام داس والدِ محترم کے شاگردوں میں تھے۔ عیسیٰ خیل میں جب والد ہیڈ ماسٹر تھے تو ہرنام داس وہاں سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ بعد میں والد کلورکوٹ میں کچھ مدت قیام کرنے کے بعد راولپنڈی منتقل ہو گئے اور ہرنام داس نے طِب کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور میں مطب کھول لیا۔ والد جب لاہور آتے تھے تو انہی کویراج ہرنام داس کے یہاں قیام کرتے تھے۔ اسی مطب میں ماہنامہ ''علم و عمل'' کا دفتر تھا۔ وقار صاحب ''علم و عمل'' سے بھی وابستہ تھے اور اسی دفتر میں والد کی اُن سے ملاقاتوں کی ابتداء ہوئی۔

والد جب لاہور سے واپس راولپنڈی جاتے تھے اور لاہور کی باتیں سُناتے تھے تو وقار انبالوی اور اُن کی شاعری کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ ''چندن'' اور ''علم و عمل'' میں میری نظر سے ہی اُن کا کلام گزرتا تھا۔ اُسی زمانے میں وقار صاحب روزنامہ ''ملاپ'' کو بھی وقت دیا کرتے تھے۔ اُن کی نظمیں قارئین ''ملاپ'' میں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کچھ مدت بعد ماہنامہ ''چندن'' سے مہاشے سدرشن کا نام غائب ہوگیا اور اس پر صرف وقار انبالوی کا نام آنے لگا۔ غالباً کویراج ہرنام داس نے ماہنامہ ''چندن'' مہاشے سدرشن سے خرید لیا تھا اور انھوں نے وقار صاحب کو اس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا تھا لیکن مہاشے سدرشن کی علیحدگی کے بعد ''چندن'' چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا کیونکہ اُس میں سدرشن کے افسانے چھپنے بند ہو گئے تھے اور اس کی ساری مقبولیت سدرشن کے افسانوں کی وجہ سے تھی۔

یہ تمام باتیں ۱۹۳۷ء سے یعنی میرے لاہور آنے سے پہلے کی ہیں۔ میں جب ۱۹۳۷ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور آیا تو ''چندن'' بند ہو چکا تھا اور وقار صاحب روزنامہ ''پرتاپ'' میں کام کرتے تھے اور حالاتِ حاضرہ پر اُن کی نظمیں ''پرتاپ'' کی مقبولیت کا بڑا سبب تھیں۔ اس وقت وقار صاحب ''ہدایت نامہ خاوند'' کو منظوم کرنے کے بعد کویراج ہرنام داس کی دُوسری تصنیف ''ہدایت نامہ بیوی'' کو منظوم کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ان نظموں میں شاعری کہاں ہوگی، وہ تو وقار صاحب کی قادرالکلامی تھی کہ جس طرح ہم لوگ نثر میں بات کرتے ہیں اسی طرح یعنی اسی آسانی کے ساتھ وہ مصرع موزوں کر لیا کرتے تھے۔

کویراج ہرنام داس کے مطب میں ایک کمرہ مہمانوں کے لئے وقف تھا۔ چنانچہ میں جب لاہور آیا تو میں نے بھی اُسی کمرے کو اپنی قیام گاہ بنایا۔ اس سے مجھے یہ حاصل ہوا کہ ہر دوسرے تیسرے دن وقار صاحب سے ملاقات ہونے لگی۔ وقار صاحب کو شاعری کے رموز میں جو گہری نظر حاصل تھی وہ کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ وہ بات بات میں شعر و سخن کی باریکیوں سے مجھے آشنا کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ اُنہی دنوں اُن کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس میں اوّل سے آخر تک اسماء کے سوا اور کچھ نہیں تھا نہ افعال نہ حروف۔ اس نظم کا صرف آخری مصرع مجھے یاد رہ گیا ہے:

رات، تنہائی، قلم، کاغذ، وقار

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اس مصرعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نظم کی ساخت کیا رہی ہوگی۔ اسی زمانے میں ان کا مجموعہ کلام "آہنگ رزم" مکتبہ اُردو لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا جو جنگی نظموں پر مشتمل تھا۔ یہ اس طرح کی جنگی نظمیں نہیں تھیں جس طرح کی نظمیں دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ابوالاثر حفیظ جالندھری (سانگ پبلسٹی آرگنائزر، گورنمنٹ آف انڈیا) کی فرمائش پر اکثر اُردو شعراء نے کہیں بلکہ شاعر کے اپنے انداز میں جو ایک رزمیہ کیفیت پنہاں تھی، یہ نظمیں اس کا پرتو تھیں۔ مثلاً ایک نظم میں بچہ اپنے والدین سے کہتا ہے:

مجھے چھوٹی سے ایک تلوار لا دو
نشانِ جرأت پیکار لا دو

غالباً "آہنگ رزم" کا نیا ایڈیشن مکتبہ کارواں لاہور نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

میں نے چند سطور قبل والد اور وقار کے باہمی مراسم کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک رُباعی بھی درج کی گئی ہے۔ والد کے اسی سفر لاہور کا ذکر ہے۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا باتوں باتوں میں وقار صاحب نے اُن سے کہا اس جنگ کا انجام کیا نظر آ رہا ہے۔ والد ایک آدھ منٹ خاموش رہے پھر بولے:

ہو لاکھ مئے خودی سے ہٹلر سرمست
ہو جائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر میں خوراک ختم ہو جائے گی
کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

ایک اخبار کا ایڈیٹر ایسی چیزیں کہاں چھوڑتا ہے۔ وقار نے فوراً یہ رُباعی لکھ لی اور اگلے دن اپنے تمہیدی نوٹ کے ساتھ اخبار میں شائع کر دی۔

اُسی سفر کی بات ہے وقار اور والد اکٹھے جا رہے تھے۔ دیواروں پر جا بجا سینما کے پوسٹر لگے تھے ان پر وہی عام تصویریں بنی تھیں، نیم عریاں قسم کی۔ وقار نے تصویروں کی جانب

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اِشارہ کیا اور کہا ''ملاحظہ فرمایا آپ نے؟'' والد نے جواب میں کہا۔

لبِ عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے مگر
آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں

خلوتِ خاص میں جس بات سے آتی ہے حیا
مظہرِ عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں

والد کا مجموعہ کلام ''گنجِ معانی'' شائع ہوا تو وقار صاحب نے اس پر اپنے مذکورہ ماہنامے ''چندن'' میں ایک بھرپور مضمون لکھا۔ یہ مضمون شاعری میں وقار کی گہری نقادانہ نظر کی دلیل ہے۔ یہ مضمون اس وقت راقم التحریر کی کتاب ''تلوک چند محروم'' مطبوعہ ادارۂ فروغِ اُردو، لکھنؤ (۱۹۵۹ء) میں شامل ہے۔ یوں تو یہ مضمون وقار کی شگفتہ نثر نگاری کا ایک مرقع ہے لیکن میں اس میں بیان کیا ہوا صرف ایک ہی تنقیدی نکتہ یہاں پیش کروں گا۔ شراب کی مذمت میں والد کی ایک نظم ہے جس میں یہ شعر آتا ہے ۔

جلا کے جوہرِ ادراک کو دُھواں کر دے
دماغ کو وہ اُبالے کہ نیم جاں کر دے

اس نظم کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ '' شاعری کے لئے نصیحتوں کا موضوع' کسی قدر خشک موضوع ہے لیکن محروم کی قادرالکلامی اور شاداب خیالی نے اس صحراء میں بھی گلہائے مضمون کھلائے ہیں۔'' اور پھر مذکورہ شعر درج کر کے نیچے حاشیے میں لکھتے ہیں:

''ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ خلافِ محاورہ ہے۔ میں نے ان کی عقل پر ماتم کیا اور کہا کہ جوہرِ ادراک کی خاک سے جوہرِ ادراک کا دُھواں زیادہ بلیغ ہے اور یہ کہ محل محاورہ نہیں ہے لیکن وہ اڑے رہے۔''

افسوس کہ مذکورہ کتاب ''آہنگِ رزم'' کے علاوہ وقار صاحب کا صرف ایک مجموعہ نظم

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

شائع ہوا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کا نام "بیانِ حال" ہے اور یہ مکتبہ "نوائے وقت" لاہور نے شائع کیا تھا اور نثری مضامین کا تو ان کا کوئی مجموعہ شائع ہی نہیں ہوا۔

گارڈن کالج راولپنڈی سے نکل کے میں لاہور پہنچا تو بے کاری استقبال کے لئے موجود تھی۔ وقار صاحب سے میں نے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ طے پایا کہ کسی روزنامہ اخبار میں پارٹ ٹائم نوکری کر لی جائے اور ایم اے میں داخلہ لے لیا جائے۔ خیال یہ تھا تیس روپے ماہانہ میں کام چل جائے گا۔ وقار صاحب اگرچہ خود روزنامہ "ملاپ" کو چھوڑ چکے تھے لیکن "ملاپ" کے مالکوں مہاشے خوشحال چند خورسند اور ان کے فرزند رنبیر جی سے ان کے مراسم بہت اچھے تھے چنانچہ مجھے اپنے ساتھ لے کے وہ "ملاپ" کے مالک رنبیر جی کے وہاں پہنچے۔ رنبیر جی نے تھوڑی دیر بات چیت کے بعد خود ہی چالیس روپے ماہانہ کی پیش کش کر دی۔ وقار صاحب نے چھوٹتے ہی کہا "یہ تو تیس روپے کی توقع پر آیا تھا۔" رنبیر جی بولے "تنخواہ تو اب بھی تیس ہی ہے۔ دس روپے مزید اس لئے ہیں کہ میں ان سے "رباعیاتِ عمر خیام" پڑھوں گا لیکن جب تک میں "ملاپ" میں رہا رنبیر جی کو رباعیاتِ عمر خیام پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں وقار صاحب کے گھر میں بیٹھا تھا۔ نیچے سگریٹ والے کی دکان تھی۔ اچانک اس دکان سے ایک چھوٹا سا لڑکا آیا اور کہنے لگا کل میں سگریٹ کی ڈبیا دے گیا تھا اُس کے پیسے لینے آیا ہوں۔ وقار صاحب نے کہا غالباً کل تم سگریٹ کی دو ڈبیاں دے گئے تھے۔ یہ لو پیسے۔ اُس نے کہا جی نہیں میں صرف ایک ڈبیا دے گیا تھا۔ مجھ سے اُنھوں نے کہا "آزاد، اس ایش ٹرے میں جلے ہوئے سگریٹ کے کتنے ٹکڑے پڑے ہیں ذرا گن کر بتاؤ۔" میں نے ٹکڑے گنے تعداد میں بیس تھے۔ کہنے لگے "یہ لڑکا بے وقوف ہے، کہتا ہے ایک ڈبیا لایا تھا دراصل یہ دو لایا تھا....." اور اُسے دو ڈبیوں کے پیسے دے کر رخصت کر دیا۔ میں اُن کی "حساب دانی" کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

جب آپ روزنامہ ''احسان'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو میں اُس وقت پھر بے کار تھا۔ ''ملاپ'' کی ملازمت ختم ہو چکی تھی۔ ایک شاعر صاحب جو ''ملاپ'' کے ایڈیٹر تھے مجھ سے خفا رہتے تھے۔ بات یہ ہے کہ ان کی نظموں پر سالک صاحب کے اخبار ''انقلاب'' میں اکثر اعتراضات ہوتے رہتے تھے۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ تم ان اعتراضات کا جواب لکھو۔ جب غلط شاعری پر صحیح اعتراضات ہوں تو میں کیا جواب لکھتا۔ میں معذرت کر دیتا تھا۔ اُنھیں یہ شک ہو گیا کہ در پردہ ان اعتراضات کے پیچھے میرا ہاتھ ہے حالانکہ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ اعتراضات تو سالک صاحب کے کالم ''افکار حوادث'' میں ہوتے تھے اور یہ کالم سالک صاحب خود لکھا کرتے تھے۔ اُن کی تحریر کی نشتریت کسی اور کے بس کی تو تھی نہیں۔ آخر میں اس صورت حال سے تنگ آ گیا اور ''ملاپ'' سے مستعفی ہو گیا۔

اُس وقت وقار صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم ''احسان'' میں آ جاؤ۔ ہم ''ملاپ'' سے زیادہ تنخواہ دیں گے چنانچہ میں نے ''احسان'' کے دفتر جانا شروع کر دیا لیکن وہ زمانہ انتہائی فرقہ وارانہ مناقشت کا زمانہ تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذاتی تعلقات میں تو کوئی خرابی نہیں تھی اور ''احسان'' کے دفتر میں میری حیثیت ایک مہمان عزیز کی تھی لیکن وہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ مہاتما گاندھی، موتی لعل نہرو، ابوالکلام آزاد اور سبھاش چندر بوس وغیرہ کو میں ہندوستان کا نجات دہندہ سمجھتا تھا۔ اُن کے خلاف ''احسان'' میں کچھ نہ کچھ چھپتا تھا۔ کبھی مجھے اس طرح کی عبارت کے پروف پڑھنا پڑتے تھے، کبھی کوئی نوٹ لکھنا پڑتا تھا اور طبیعت اس کے خلاف بغاوت کرتی تھی۔ میں نے وقار صاحب سے اپنی مشکل بیان کی۔ بڑی فراخ دلی سے کہنے لگے ''اگر جی نہیں چاہتا تو کوئی مجبوری نہیں۔ میں تمہارے لئے کسی اور جگہ ملازمت کا انتظام کر دوں گا۔'' چنانچہ میں نے پانچ سات روز کام کرنے کے بعد وہاں جانا ترک کر دیا۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا کہ آل انڈیا ریڈیو کی ابتداء کس سن میں ہوئی لیکن آل انڈیا ریڈیو سے پہلے لاہور میں فلپس کمپنی نے ریڈیو کی ابتداء کی تھی۔ وائی ایم سی ہال (مال روڈ)

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میں اس کا سٹوڈیو تھا۔ شہر میں مختلف جگہوں پر اُنھوں نے چند ریڈیو سیٹ رکھ دیئے تھے مثلاً انار کلی میں' ڈبی بازار میں' اندرون لوہاری دروازہ میں' جہاں شام کو لوگوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ ریڈیو کے پروگرام سنتے تھے۔ ریڈیو کا سب سے پہلا مشاعرہ انہی فلپس والوں نے کرایا تھا۔ اُس میں کہنہ مشق شعراء بھی مدعو تھے اور متبدی بھی۔ کہنہ مشق شعراء میں وقار انبالوی تھے اور متبدی شعراء میں راقم التحریر۔ فلپس والوں کو نہ جانے کس نے مشورہ دیا کہ اُنھوں نے تمام شعراء کو دس دس روپے کا چیک پیش کر دیا۔ میں تو دس روپے کا چیک پا کے بہت خوش ہوا۔ ریڈیو کا مشاعرہ اور پھر دس روپے معاوضہ' اور کیا چاہیئے ——— لیکن وقار صاحب نے اسے اپنی ہتک سمجھا اور چیک کے پیچھے

"شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو"

لکھ کر چیک واپس کر دیا۔ یہ چیک واپس کرنے سے پہلے اُنھوں نے مُجھے دکھایا۔ میں نے کہا کہ اگر چیک واپس ہی کرنا تھا تو یہ لکھتے 'عطائے تو بہ لقائے تو'۔ بہت خوش ہوئے' مُجھے تھپکی دی اور کہنے لگے کہ یہ مشورہ تُم ہی دے سکتے تھے۔ پھر مُجھ سے کہنے لگے کہ تُم اپنے چیک کے پیچھے یہی لکھ کر (عطائے تو بہ لقائے تو) واپس کر دو لیکن میں دس روپے کی گراں قدر دولت کیسے واپس کر سکتا تھا۔

□□□

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

عابد مناوری

۲۰ ستمبر کی صبح تھی۔ میں ابھی جاگا ہی تھا کہ پرتپال سنگھ بیتاب کا ٹیلی فون آیا۔ اُنھوں نے کہا "بہت بری خبر ہے۔" اس طرح کی بات سُنتے ہی انسان گھبرا جاتا ہے، میں بھی گھبرا گیا اور میرے منہ سے نکلا "یعنی" اُنھوں نے کہا "کل شام کو عابد مناوری کا انتقال ہو گیا ہے۔" میں سناٹے میں آ گیا۔ اگرچہ چند روز قبل جنوبی ہند کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے سُنا تھا کہ عابد کی طبیعت اچھی نہیں ہے اور وہ زیرِ علاج ہیں مگر اپنی مصروفیات کی بنا پر اُنھیں دیکھنے نہ جا سکا جس کا مجھے اس وقت تک افسوس ہے لیکن یہ اندازہ بھی مجھے نہیں تھا کہ اُن کی یہ علالت انجام کار مرض الموت ثابت ہو گی۔

گیارہ بجے شاستری نگر کے شمشان میں عابد کے آخری سنسکار کا وقت طے تھا، ساڑھے دس بجے کے قریب پرتپال سنگھ بیتاب آئے اور مجھے اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں شمشان بھومی لے گئے۔ تھوڑی دیر میں عابد کا خاکی جسم چتا کی لکڑیوں پر رکھا گیا اور آگ کے شعلوں نے آناً فاناً اس کے جسدِ خاکی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میرا ذہن اچانک اقبال کے ان اشعار کی جانب گیا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

آہ یہ دُنیا یہ ماتم خانہ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم و دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

اور عابد کے ساتھ اکثر اُن دوستوں کے چہرے ایک فلم کی صورت میں یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے آنے لگے جو شمشان کے رستے یا قبرستان سے ہو کر گئے اور پھر واپس نہ آئے۔

شمشان ہو یا قبرستان یہاں جب آنے کا اتفاق ہوتا ہے زندگی کی بے ثباتی ایک مرئی صورت میں سامنے آ جاتی ہے۔ مخدوم صاحب نے ان اشعار میں کتنے پتے کی بات کہی ہے:

طاری ہے آہ شہرِ خموشاں پہ کیا سکوت
خاموش سرزمیں کی ہے ساری فضا خموش

وادی یہ وہ ہے جس میں مسافر اُترتے ہیں
سینے میں سانس روک کے جوں نقشِ پا خموش

دم مارنے کی تاب کسی کو یہاں نہیں
پیر و جواں خموش ہیں شاہ و گدا خموش

شمشان سے چلے تو میں خیالوں میں ڈوب گیا۔ دماغ پر بہت زور ڈالنے کے باوجود یاد نہ آیا کہ عابد سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ یوں تو ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے میں ۱۹۳۸ء میں پہلی بار جموں آیا لیکن ۱۹۳۸ء تو عابد کا سالِ پیدائش ہے۔ اس حساب سے میں نے اندازہ لگایا اور ساتھ ہی ماضی کی راکھ کو کریدنا شروع کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ عابد سے پہلی ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ جب کہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے والدِ محترم اور میں دہلی سے آئے تھے۔ دن میں عابد ہم دونوں سے ملنے آئے اور کافی دیر

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

باتیں کیں۔ عابد نے بات چیت کے دوران میں یہ بھی بتایا کہ وہ جوش ملسیانی کے شاگرد ہیں۔ اسی مشاعرے میں عابد نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ اُس کی غزلوں کا ایک مجموعہ ''بہارِ غزل'' کے نام سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس مجموعے کے مسوّدے کی ایک نقل اُنھوں نے آج ہی محروم صاحب کو دی ہے اور اُن سے کتاب کا ابتدایہ لکھنے کی درخواست کی ہے، آپ بھی اُن سے کہہ دیجئے گا۔

والدِ محترم نے دہلی پہنچ کر عابد کا یہ مسوّدہ اوّل سے آخر تک پڑھا اور مجھ سے کہا کہ یہ لڑکا تو بہت اچھے اشعار کہتا ہے۔ میں نے اُنھیں یاد دلایا کہ جموں میں عابد نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ وہ جوش ملسیانی کے شاگرد ہیں۔ والد صاحب نے کہا جوہر ذاتی اس لڑکے کو دینے والے نے دیا ہے اور جوش ملسیانی کی شاگردی میں اس کا جوہر اور زیادہ چمک اُٹھے گا۔

''بہارِ غزل'' جب چھپی تو عابد نے اس کی ایک جلد مجھے بھی عنایت کی۔ میں نے دیکھا کہ اس میں والد صاحب کے ''حرفِ چند'' کے علاوہ جوش ملسیانی صاحب کا ''دُعائیہ''، علی جواد زیدی کی جانب سے ''تعارف'' اور شاگوالیاری کا ''دیباچہ'' بھی شامل تھا۔ کتاب پڑھی تو دیکھا کہ اس میں روایتی انداز کے اشعار بھی ہیں اور ایسے اشعار بھی ہیں جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ آگے چل کر اس کا شمار اُردو کے پختہ کلام شعراء میں ہوگا۔ مثلاً ؎

اپنی اپنی نظر ہے اے عابد　　زندگی پھول بھی ہے کانٹا بھی

عشق میں جان دینے والوں نے　　موت کو بھی حیات جانا ہے

قدم چومے ہیں آ کر منزلوں نے　　رہے کچھ اس طرح گرمِ سفر ہم

''بہارِ غزل'' ۱۹۶۱ء میں چھپی اور عرضِ ناشر کے مطابق یہ کتاب ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک کہی ہوئی غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ تین سال میں کہی ہوئی غزلیں ہیں جب شاعر کی عمر بیس

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اکیس برس ہی رہی ہوگی۔ اور میں اکیس سال تک کی عمر میں کہے ہوئے یہ اشعار یقیناً تعریف کے قابل ہیں ۔

جرأتِ شوق نے ہر موج کا رُخ پھیر دیا
جب بھی کشتی مری طوفان سے ٹکرائی ہے

طلسم گردشِ لیل و نہار ٹوٹ گیا
مگر طوالتِ شامِ فراق کم نہ ہوئی

ہم نے دیکھا ہے بہاروں میں بھی
گلشنِ دل کا بیاباں ہونا

مذکورہ کتاب ''بہارِ غزل'' پر جموں و کشمیر کی کلچرل اکیڈیمی نے سات سو روپے کا انعام دیا اور غالباً اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔

''بہارِ غزل'' کے بعد عابد کی غزلوں اور نظموں کا ایک مجموعہ ''شمیمِ گل'' کے نام سے شائع ہوا جس پر کلچرل اکیڈیمی نے انھیں ایک ہزار روپے کا انعام دیا۔ ''شمیمِ گل'' کے بعد انھوں نے ''جنت کشمیر'' کے نام سے مُلک کے شعراء کے کلام پر مشتمل ایک مجموعہ مرتب کیا۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس مجموعہ کلام میں شامل تمام منظومات کشمیر جنت نظیر کے بارے میں ہیں۔ جہاں تک اس مجموعہ کلام کا تعلق ہے اس کے لیے شعراء اور اُن کے کلام کا انتخاب عابد کے ذوقِ سلیم اور وقتِ نظری پر دلالت کرتا ہے۔ یہ کتاب تلوک چند محروم کے ایک قطعے سے شروع ہوئی ہے اور جس کے بعد اس میں برج نارائن چکبست، برج موہن دتاتریہ کیفی، خوشی محمد ناظر، جوش ملیح آبادی، جوش ملسیانی، منور لکھنوی، وامق جون پوری، جگن ناتھ آزاد، ساغر نظامی، غلام ربانی تاباں، عرش ملسیانی، کمال احمد صدیقی، مخمور سعیدی، نازش پرتاپ گڑھی، شاذ تمکنت، شباب للت، میکش کاشمیری، شمیم کرہانی، سید حرمت الاکرام،

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

یحییٰ اعظمی، عرش صہبائی، حامدی کاشمیری، کرشن موہن، خود عابد منادری اور مقامی شعراء کا کلام شامل ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے ذرا بعد میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں سری نگر آ گیا۔ اس ملازمت کے دوران میں جموں کا سفر اکثر رہتا تھا۔ ملازمت کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ اکثر جموں میں دو دو چار چار دن کا قیام بھی رہتا تھا اس لیے جموں کے اہلِ قلم حضرات سے ملنے کے بہت مواقع میسر آتے تھے۔ میرا قیام کہیں بھی ہو عابد منادری مجھے ڈھونڈ نکالتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ عابد نے مجھے اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دی اور وہیں اُن کے گھر ہی میں کھانے کے بعد شعر و شاعری کی محفل جم گئی جو رات گئے دیر تک قائم رہی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ عرش صہبائی اسٹریٹ میں رہتے تھے۔

۱۹۷۷ء میں جموں یونی ورسٹی کی دعوت پر میں جموں آ گیا اور عابد سے ملاقاتوں کا سلسلہ بہت بڑھ گیا۔ گاندھی نگر میں تو اُن کے ساتھ ایک طرح سے پڑوس کا معاملہ تھا۔ ایک مدت تک پرتپال سنگھ بیتاب، حکیم منظور، عابد منادری اور میں قریب قریب ایک ہی محلے میں رہے۔ اب اس طرح کے ہم مذاق اس محلے میں صرف میں اور اسد اللہ وانی ہیں۔ اس مدت میں یہ بات خاص طور پر میرے علم میں آئی کہ عابد شاعری کی ادبی اور لسانی خصوصیات سے بخوبی واقف ہیں۔ زبان کی صفائی اُن کے کلام کی خصوصیت تو ہے ہی اُنھیں روزمرہ اور محاورے کے استعمال پر بھی دسترس حاصل ہے۔ عروض اور قافیے کے علم کی باریکیوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اوزان کے زحافات پر اُن کی گہری نظر ہے بالخصوص وزنِ رُباعی کے مختلف زحافات پر۔ لغت کے استعمال میں اُنھیں ژرف نگاہی حاصل ہے۔ حیرت ہے کہ رموزِ شعر سے اس قدر آگاہی ہونے کے باوجود اُنھوں نے اس موضوع پر نثر میں کچھ نہیں لکھا۔

کوئی دس بارہ برس کی بات ہے کہ وہ میرے یہاں آئے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنی کئی غزلیات پر مشتمل مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس کا نام میں نے ''برجستہ'' تجویز کیا ہے۔ میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

چاہتا ہوں آپ اس کا دیباچہ لکھیں۔ میں نے کہا آپ مسوّدہ مجھے دیں میں جلد از جلد دیباچہ لکھنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد دو تین موقعوں پر ملاقات میں یہ کہا کہ مسوّدہ بہت جلد میں آپ کو دے جاؤں گا۔ لیکن اُس کتاب کا مسوّدہ مجھے کبھی نہیں ملا اور کوئی پانچ سات ماہ بعد وہ میرے لیے چھپی ہوئی کتاب کی ایک جلد لے کر آئے۔ یہ جلد اُنھوں نے میرے حوالے کی۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ورق گردانی شروع کی تو خود ہی بول اُٹھے یہ کتاب دیباچے کے بغیر ہے۔ جب اُنھوں نے دو چار ماہ تک مجھے مسوّدہ نہ دیا تو میں یہ سمجھا تھا کہ دیباچہ کسی اور سے لکھوا رہے ہوں گے لیکن یہ کتاب دیباچے کے بغیر ہے۔

معلوم نہیں مجھ سے دیباچہ لکھوانے کی فرمائش کے باوجود اُنھوں نے مجھ سے دیباچہ کیوں نہیں لکھوایا۔ وہ آزادہ رو تھے۔ ہوسکتا ہے مجھ سے کسی بات پر رنجیدہ ہو گئے ہوں۔ اس لیے کتاب لیتے وقت میں نے دیباچے کا ذکر نہیں کیا اس سے ملاقات بدمزہ ہو جاتی۔ لیکن اُنھوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی کہ میں اس کتاب پر تبصرہ کروں۔ مجھے حیرت تو ہوئی مگر میں نے ہامی بھری اور اتفاق کی بات ہے اُنھی دِنوں مجھ سے ریڈیو کشمیر جموں نے کتابوں پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے دو کتابوں پر تبصرہ کیا۔ ان میں ایک ''برجتہ'' تھی۔ عابد نے یہ تبصرہ سنا۔ دوسرے دن میرے یہاں آئے۔ تبصرے کی تعریف کی' اتنی زیادہ کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ اور میں نے یہ سمجھا کہ حضرت کو تبصرہ پسند نہیں آیا اور اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں لیکن جب اس کی نقل مانگی اور نقل لینے پر اصرار کیا تو میں نے بھی یقین کر لیا کہ اُنھیں پسند آیا ہے۔ چنانچہ میں نے نقل اُنھیں دے دی۔ اس پر ایک نظر ڈال کے کہنے لگے'' کاش یہی میری کتاب کا دیباچہ ہوتا۔'' میں نے کہا'' میں تو حاضر تھا تم نے مسوّدہ ہی نہیں دیا۔'' خاموش ہو گئے لیکن میں نے باصرار پوچھا کہ دیباچہ لکھوانے کے لیے ارادہ کیوں بدل لیا۔ نہایت معذرت بھرے انداز میں کہنے لگے کہ مسوّدہ کاتب کے پاس تھا۔ جب کتابت مکمل ہو گئی تو ناشر نے کہا کہ کتاب چھاپنے میں بہت تاخیر ہو رہی ہے اب اِتنا وقت نہیں رہا کہ دیباچے کا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

انتظار کر سکوں اور نتیجتاً کتاب دیباچے کے بغیر شائع ہو گئی۔

''برجستہ'' کا شعری معیار ''بہارِ غزل'' کے مقابلے میں بہت بلند ہے، بہت ہی بلند۔ اس میں اکثر مقامات پر فکر، فکر محسوس بنتا اور پھر خالص شاعری میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔ درد و گداز کی زیریں لہر اکثر غزلوں میں اوّل سے آخر تک نظر آتی ہے، مناور چھوڑ کر غریب الوطنی کا احساس سو پردوں میں چھپا ہوا ملتا ہے۔ ہجرت کا کرب تشبیہ اور استعارے میں پوشیدہ ہونے کے باوجود نمایاں ہے۔ روایت سے ہٹ کر جدید انداز بیان کی فراوانی بھی عابد کے ہاں ہے اور نئی نئی زمینیں بھی۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کے کلام کو نقادوں نے اس نظر سے نہیں دیکھا جس کا یہ مستحق ہے بلکہ شاعروں نے بھی ان کی شاعری کو بحث و تمحیص کا موضوع نہیں بنایا۔ صرف مشاعروں میں زبانی واہ واہ ہوتی رہی۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو لیکن غالباً ''بہارِ غزل'' کی تقریظات اور دیباچے کے علاوہ کسی نے ان کے کلام پر قلم نہیں اُٹھایا۔ بہرطور میں ''برجستہ'' کے چند اشعار پھر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

میرے آنگن میں بھی اے قوسِ قزح اک دن اُتر
زندگی میں تیرا اک اک رنگ بھرنا ہے مجھے

پَر سمیٹے تو یہ ہُوا محسوس — اور ہی کچھ مرا اُڑان میں تھا
ہم الگ ہو کے بھی الگ نہ ہوئے — ٹوٹتا رشتہ درمیان میں تھا

بخش دے گا وہ مجھے سات سمندر لیکن
ایک قطرے سے لبوں کو نہ بھگونے دے گا
خواب زاروں ہی میں بھٹکائے گا وہ تا بہ سحر
جاگنے دے گا مجھے اور نہ سونے دے گا

یوں دُور سے نہ تیشہ و آذر دکھا مجھے — مجھ کو تراش کر مرا پیکر دکھا مجھے
عابد یہ کیا ہوا ہے کہ اپنے ہی گھر میں آج — اک اک سے کہہ رہا ہوں مرا گھر دکھا مجھے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اُس نے لکھ بھیجا ہے یہ پیپل کے پتے پر مجھے
کیا تجھے راس آ گئی بجلی کے پنکھے کی ہوا

نگر نگر دلِ مضطر لیے پھرا مجھ کو   مجھے تلاش تھی جس کی نہ مل سکا مجھ کو
میں آندھیوں سے لڑوں گا یہ میں نے سوچا تھا   ہوا کا ایک ہی جھونکا بُجھا گیا مجھ کو
میں ایک راز تھا دُنیا کے واسطے عابد   اس اک نظر نے مگر فاش کر دیا مجھ کو

کوئی آ کر جھونک دیتا ہے مری آنکھوں میں دُھول
چاہتا ہوں خود کو جب اپنے برابر دیکھنا

ریزہ ریزہ ہو کے گلیوں میں بکھر جاؤ گے تم
ایک دن میری طرح گھر سے نکل کر دیکھنا

کر دیا تقسیم اسے بھی سرحدوں کی ضرب نے
کیوں کر اب ممکن ہوا ہے عابد مناور دیکھنا

یہ عابد کا ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۶ء تک کا کلام ہے۔ اس کے بعد تیرہ سال اور گزر چکے ہیں۔ اس تیرہ برس کی مدت میں عابد کا فن اور بلندیوں پر گیا ہے۔ اُن کی نئی غزلیں ہم میں سے اکثر نے سُنی ہیں اور پڑھی ہیں۔ معلوم نہیں جموں اور کشمیر کا کوئی ادبی ادارہ اُس کلام کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کرے گا یا نہیں۔ اگر ایسا ہو سکا تو کیا ہی کہنا اور اگر نہ ہو سکا تو ایک اچھے شاعر کے ساتھ یہ بے اِنصافی جموں و کشمیر کی تاریخ ادب کا ایک ناخوشگوار باب بن کر رہے گی۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

پریم ناتھ در

سرزمینِ کشمیر کو اپنے جن اہلِ قلم فرزندوں پر ہمیشہ ناز رہے گا اُن میں پریم ناتھ در کا نام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ وہ صفِ اوّل کے افسانہ نگار تھے اور اُنھوں نے ایک ایسے دور میں اپنے کمالِ فن کو بلندی پر پہنچا کر خاص و عام سے خراجِ تحسین وصول کیا جب دُنیائے اَدب میں اور بالخصوص دُنیائے افسانہ میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، آغا بابر، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، اوپندر ناتھ اشک اور خواجہ احمد عباس کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ ان کوہِ وقار فکشن نگاروں کی موجودگی میں دُنیائے افسانہ میں ایک نو وارد کا اپنے آپ کو منوالینا بہت بڑی بات ہے۔

پریم ناتھ در میرے دوست تھے۔ قریب قریب ہر روز کا ملنا تھا۔ فرائضِ منصبی کے اعتبار سے بھی ہم دونوں ایک دُوسرے کے بہت قریب تھے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے اور میں پریس انفارمیشن بیورو سے بلکہ کچھ مُدت ہم دونوں ایک ہی عمارت، آکاش وانی بھون، نئی دہلی میں اپنے اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے اور ظاہر

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہے کہ اِس ماحول میں ہمیں ایک دُوسرے کو جاننے پہچاننے کے اَن گنت مواقع میسر آئے ہوں گے اور اِن اَن گنت مواقع کی بدولت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پریم ناتھ در کی شخصیت اور فن میں جو مماثلت اور ہم آہنگی مجھے نظر آئی وہ بہت کم اہلِ قلم حضرات میں نظر آتی ہے۔

پریم ناتھ در کا دِل سرزمینِ کشمیر کی محبت سے لبریز تھا اور یہی محبت اُن کے افسانوں میں رچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اُنھوں نے کشمیر کے اُس حسن کو بھی اپنے افسانوی ادب کے تانے بانے میں سمویا ہے جو قدرت نے فیاضانہ طور پر کشمیر کے لیے وقف کر دیا ہے اور اُس افلاس، غریبی، بے کاری اور بے روزگاری کو بھی، جس کا مداوا آج تک نہ حکومتِ ہند کر سکی ہے اور نہ حکومتِ جموں و کشمیر

پریم ناتھ در اور مَیں جب اکٹھے بیٹھتے تھے تو اکثر کشمیر اور سیاستِ کشمیر بات چیت اور بحث مباحثے کا موضوع بن جاتی تھی اور ہم اکثر اِس امر میں باہمی طور پر متفق ہوتے تھے کہ حکومتِ ہند کو اِس معاملے میں یوں نہیں کرنا چاہئے اور یوں کرنا چاہئے، یہ نہیں ہونا چاہئے اور وہ ہونا چاہئے۔

پریم ناتھ در نے اکثر مجھ سے یہ کہا کہ یار یہ بتاؤ کہ حکومتِ ہند جو کروڑوں بلکہ اَربوں روپیہ جموں و کشمیر کی ترقی کے لیے حکومتِ جموں و کشمیر کو دے رہی ہے وہ کہاں جا رہا ہے۔ میں اِس سوال کا کیا جواب دیتا؟ ہم دونوں اِس معاملے میں بے اختیار تھے اور بے بس! لیکن اِتنا جانتے تھے کہ جموں و کشمیر کے عمالِ حکومت کا روپے کا صحیح استعمال نہ کرنا اور حکومتِ ہند کا چشم پوشی کرنا ضرور ایک دِن رنگ لائے گا۔

پریم ناتھ در کے افسانے رُومان اور حقیقت کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ اُنھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے دِلکش اور خوبصورت نثر میں لکھا ہے۔ اُن کی تحریر ''دل خیزد بہ دل ریزد'' کے مصداق اپنے ہر قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اِس طرزِ تحریر کی بدولت اُنھوں نے اپنے فکر اور اُسلوبِ بیان کو اِس طرح ایک دُوسرے میں سمویا ہے کہ ایک کو دُوسرے سے الگ کر

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کے دیکھنا دشوار ہے۔

مجھے یاد ہے کہ شروع شروع میں جب اُن کا کوئی افسانہ "ادبی دُنیا" لاہور میں چھپتا تھا تو مدتوں لاہور کی دُنیائے ادب میں اس کا چرچا رہتا تھا "ادبی دُنیا" کے مدیر مولانا صلاح الدین کو، جن کے نئی نسل کے ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں پر ہزاروں احسانات ہیں، میں نے اکثر پریم ناتھ در کے ذکر میں رطب اللساں پایا۔

پریم ناتھ در کا جب انتقال ہوا تو میں سری نگر میں تھا۔ انتقال کی خبر سنتے ہی ریڈیو کشمیر سری نگر کے ایک پروڈیوسر میرے یہاں تشریف لائے اور آتے ہی اُنھوں نے مجھ سے میرے تاثرات کی فرمائش کی۔ میں در کے انتقال کی خبر سنتے ہی سناٹے میں آگیا اور اُس وقت انتہائی غم و اندوہ کے عالم میں چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں نے اُن کے ٹیپ ریکارڈر میں صدا بند کرا دیئے جو بعد میں ریڈیو کشمیر نے ریکارڈر سے نقل کر کے مجھے بھیجے اور میری کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں شامل ہیں۔ میں اُنھی تاثرات پر اپنی یہ چھوٹی سی تحریر ختم کر رہا ہوں:

> "پریم ناتھ در کی موت ایک بہت اچھے ادیب، بہت اچھے افسانہ نگار، اور بہت اچھے دوست کی موت ہے۔ میرے اور پریم ناتھ در کے باہمی مراسم کی عمر خاصی طویل ہے اور اسی سبب سے میں پریم ناتھ در کے اس دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا محسوس کر رہا ہوں۔
>
> پریم ناتھ در کی شخصیت ہر اعتبار سے دلکشی سے لبریز تھی۔ اُن کی بات چیت، لب و لہجہ، ملنا جلنا، رکھ رکھاؤ یہ سب لوگوں کے لیے ہمیشہ باعثِ رشک رہا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

دفتری مصروفیات کے باوجود اپنے فن کے ساتھ اُن کی لگن میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اُکھڑ کے ہندوستان آئے تو دہلی میں سب سے پہلے جو ادبی بزم جمی وہ پریم ناتھ در کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی جو اُن دنوں دہلی کالج میں پڑھاتے تھے، پریم ناتھ کے گہرے دوست تھے۔ پریم ناتھ در نے اُن کے ساتھ مل کے حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک طرح سے لاہور ہی کے حلقہ ارباب ذوق کا تسلسل تھا، ذہنی اور جذباتی اعتبار سے' اور پریم ناتھ در کی کوششوں سے ہر ہفتے حلقہ ارباب ذوق کی محفل باقاعدگی سے دلّی کالج میں منعقد ہوتی تھی۔ پریم ناتھ در ہمیشہ باقاعدگی سے ہم لوگوں کو اپنے ہاتھ سے لکھ کے دعوت نامے بھیجتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس میں پریم ناتھ در اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے علاوہ ساحر لدھیانوی، پرکاش پنڈت، مہدی عباس حسینی، شمیم کرہانی، غلام احمد فرقت، ریوتی سرن شرما، عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ ایسے فن کار باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ آج یہ محفلیں منعقد کرنے والا خود ایک یاد بن کے رہ گیا ہے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اور اس وقت کسی پرانے شاعر کا یہ مصرع بے اختیار
مجھے یاد آرہا ہے۔
ع - تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی "

اور آخر میں یہ کہنا میرا ایک خوش گوار فرض ہے کہ میرے دوست جناب حسرت گڈانے پریم ناتھ در کے افسانوں کا مجموعہ "چناروں کے سائے میں" کے زیرِ عنوان مرتب کر کے جس ادبی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے اُس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حسرت گڈا صاحب کی یہ کاوش جو ایک ادبی خدمت بھی ہے اور سماجی خدمت بھی دنیائے ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ایک فارسی شاعر نے کیا عمدہ کہا ہے:

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

(۱۱ر مارچ ۱۹۹۱ء)

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

شورش کاشمیری

شورش مرحوم سے میرے مراسم کی ابتداء کب ہوئی یہ اتنی پرانی بات ہے کہ اس وقت پوری طرح سے اوّلین ملاقاتوں کا سال، مہینہ یاد نہیں آ رہا ہے۔ اور صحیح طور پر یاد کیسے آئے اس بات کو اب چوالیس برس ہو رہے ہیں۔ بقول حفیظ

ع - نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

یہ مراسم غالباً اُس وقت شروع ہوئے جب میں ۱۹۳۷ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔اے کا امتحان پاس کر کے ایم۔اے میں داخلہ لینے کے لیے لاہور آیا۔

لاہور پہنچتے ہی میرا شورش سے قریب تر ہو جانا بلا وجہ نہیں تھا۔ ہم دونوں میں ایک بہت بڑی قدر مشترک تھی اور وہ تھی "کلامِ اقبال سے عشق" ہم دونوں اس معاملے میں ایک دوسرے کے رقیب تھے لیکن یہ ایسی رقابت تھی جس کے متعلق علامہ اقبال ایک بڑی اونچی بات کہہ گئے ہیں:

محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد

بہ طوفِ شعلہ پروانہ با پروانہ می سازد

شورش مجھ سے اس معاملے میں زیادہ خوش نصیب تھے کہ علامہ اقبال کے یہاں انھیں حاضری کا موقع ملتا رہتا تھا۔ میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

گرمیِ آرزو فراق شورشِ ہائے وہو فراق
موج کی جستجو فراق قطرے کی آبرو فراق

کی تصویر بنا ہوا تھا اور قرب نے بُعد کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔

شورش کے ساتھ قرب اور دوستی کا ایک اور سبب یہ تھا کہ مجھے شورش کی شخصیت، اُن کی شاعری اور اُن کی نثر تینوں پسند تھیں۔ اور تینوں آج بھی پسند ہیں۔ آج شورش ہم میں موجود نہ سہی لیکن اُن کی شاعری اور نثر پاروں کی طرح اُن کی شخصیت بھی ابھی تک باقی ہے۔ میرے دل میں، میری آنکھوں کے سامنے ——— عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں۔

اس وقت تک شورش کی نظم و نثر پر مشتمل متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یقیناً غیر مطبوعہ نظموں، مضامینِ نثر اور مکاتیب کی تعداد، کتابی صورت میں مطبوعہ نظموں اور نثر پاروں سے کہیں زیادہ ہوگی۔ یہ ادب پارے اگر جلد مرتب ہو کے کتابی صورت میں ہمارے سامنے نہ آ سکے تو اندیشہ ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے اخبارات اور رسائل کے صفحات میں ابدی نیند سو جائیں گے۔

اس سلسلے میں مجھے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی ہے کہ پروفیسر اقبال جاوید (سرگودھا) نے یہ ذمہ داری سنبھال لی ہے اور وہ ان دنوں شورش کے مختلف رسائل اور اخبارات میں بکھرے ہوئے کلام اور اُن کی نثر کو یکجا کر کے اُنھیں کتابی صورت دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ میں اُن کی کامیابی کے لیے دُعا گو ہوں۔

شورش کی نظم پر مولانا ظفر علی خان کے اندازِ بیان کا اثر نمایاں ہے اور نثر پر ظفر علی خان کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا۔ لیکن اس کے باوجود شورش کا ایک اپنا انفرادی اُسلوب ہے۔ ایک اپنا اندازِ نگارش ہے اور اپنی آواز ہے۔ خدا کرے پروفیسر اقبال جاوید کی کوشش سے یہ اُسلوب، یہ اندازِ نگارش اور یہ آواز ہمارے ادب میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔ اُردو دُنیا ان نگارشات کو دیکھنے کی مشتاق ہے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

☆☆☆

مولانا ظفر علی خان سے میری پہلی مُلاقات شورش کاشمیری ہی کی بدولت ہوئی۔ مولانا ظفر علی خان میرے پسندیدہ شاعروں میں تھے اور ہیں۔ میں نے شورش سے مولانا کے ساتھ اپنی ملاقات کی خواہش کا ذکر کیا تو شورش مجھے ایک دن اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مولانا ظفر علی خان میکلوڈ روڈ پر میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کے بزنس سنٹر اور مطبعے کے اُوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی شورش نے بہت اچھے لفظوں میں مولانا صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ مولانا نے والدِ محترم کی خیریت کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ حال ہی مرحوم صاحب کی ایک غزل ہم نے ''زمیندار'' میں شائع کی تھی۔ بہت اچھی غزل تھی۔ میں نے کہا جی ہاں'' آپ نے اس غزل کے شروع میں چند تعریفی جُملے بھی لکھے تھے۔'' اُنھوں نے تائید کی اور فرمایا آپ کو اُس غزل کا ایک آدھ شعر یاد ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ اُنھوں نے ارشاد کیا کہ اُس غزل کے دو ایک شعر میں اُنھیں سناؤں۔ میں نے مندرجہ ذیل دو اشعار اُنھیں سنائے ؎

حسیں ہے وہی جس کی سیرت حسیں ہے
وہ ظاہر ہی کیا جس کا باطن نہیں ہے

اُڑے لاکھ اوجِ فلک پر یہ انساں
مقام آخر کار زیرِ زمیں ہے

اُنھوں نے ہامی بھری اور فرمایا کہ یہی غزل تھی۔

اس کے بعد مولانا صاحب اور شورش نے سیاسی امور پر آپس میں بات چیت شروع کر دی۔ میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ مجھے بہت دیر خاموش دیکھ کر مولانا نے فرمایا کہ اس موضوع پر آپ بھی کچھ کہیے۔ میں نے عرض کیا جناب ''زمیندار'' باقاعدہ والد صاحب کے نام آپ بھجواتے ہیں۔ میں اُس میں ہر ہفتے آپ کی نظم اور سالک صاحب کے ''افکار و حوادث''

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

پڑھتا ہوں۔ سیاسی خبروں پر نظر ہی ڈالتا ہوں۔ سیاست میرا موضوع نہیں ہے لیکن کچھ دن سے سیاسی موضوع پر ایک بات آپ سے پوچھنے کا آرزو مند ہوں۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ اُنھوں نے اجازت دے دی اور میں نے سوال کیا کہ:

مہاتما گاندھی کی تعریف میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے آپ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے علاوہ غالباً کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بھی رُکن رہے۔ اور تھوڑی مدت قبل آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں جب آپ نے فرمایا کہ نماز کا وقت ہے جلسہ وقتِ نماز کے لئے ملتوی کر دیا جائے اور گاندھی جی نے کہا کہ جو حضرات نماز پڑھنے کے لیے جانا چاہتے ہیں وہ جائیں ہم اُن کی غیر حاضری میں کسی اہم مسئلے کو نہیں اُٹھائیں گے' چھوٹے موٹے مسائل جو متنازعہ فیہ نہیں ہوں گے اُن سے نپٹ لیں گے تو آپ نے جلسے کو ملتوی کرنے پر زور دیا اور گاندھی جی کے یہ کہنے پر کہ شقیں بہت زیادہ ہیں جلسے کا التواء مناسب نہیں ہوگا تو آپ خفا ہو کر اُٹھ گئے اور ہمیشہ کے لیے کانگریس سے الگ ہو گئے۔ اس ذرا سی بات پر آپ نے اِس قدر اہم فیصلہ کیوں لے لیا۔

مولانا نے فرمایا کہ میں جب اُٹھ کے چلنے لگا تو میرا خیال یہ تھا کہ گاندھی جی آواز دے کے مجھے روک لیں گے اور میں رُک جاؤں گا۔ لیکن میرے اُٹھ کے چلنے کے باوجود گاندھی جی نے مجھے نہیں روکا۔ میں ہر قدم پر اسی اُمید میں رہا کہ گاندھی جی مجھے آواز دیں کہ مولانا آپ واپس

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

آ جایئے' اُٹھ کے نہ جایئے لیکن اُن کی آواز نہ آئی۔ آخر میں
مین گیٹ تک پہنچ گیا اور جب کوئی آواز نہ آئی اور میں نے
قدم مین گیٹ سے باہر نکال دیا تو طے کر لیا کہ اب کانگریس
میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اُسی فیصلے پر میں آج تک قائم
ہوں۔

میں یہ جواب سُن کے سناٹے میں آ گیا کہ اتنی سی بات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کا رُخ ہی بدل گیا۔ شورش نے مجھے سناٹے کے عالم میں دیکھ کے فوراً یہ جُملہ کہا کہ تم تو ایسے خاموش ہو گئے ہو جیسے تمھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ ع۔ 'زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد' بنے بیٹھے ہو۔ سیاست میں ایسی باتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔

لیکن میرے لیے یہ بات آج بھی، جب کہ اسے سنے زمانہ ہو گیا ہے حیرت کا باعث ہے۔

☆☆☆

قیامِ لاہور کے زمانے میں شورش سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اُس زمانے میں "بیسہ" اخبار اسٹریٹ میں وہ مقیم تھے۔ ان کے گھر کے قریب ایک دودھ دہی والے کی دُکان تھی۔ چائے وہ بہت عمدہ تیار کرتا تھا۔ میں اور قتیل شفائی جب اکٹھے ہوتے تھے تو شورش کے گھر کا رُخ کیا کرتے تھے۔ شورش اُسی دکان کی چائے سے ہماری مہمان نوازی کرتا تھا۔ اس چائے کی خوبی یہ تھی کہ چائے تیار کرنے والا چائے میں دُودھ کی جگہ بالائی ملاتا تھا۔ اب نہ قتیل شفائی ہے نہ شورش ——— اُن کی یاد ہی باقی رہ گئی ہے۔

☆☆☆

اس وقت شورش کے ساتھ ایک اور ملاقات یاد آ رہی ہے۔ میں اور غلام ربانی تاباں لائل پور کے ایک مشاعرے سے لاہور آ رہے تھے۔ محمد طفیل مدیر "نقوش" نے ہم دونوں کو

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

مال روڈ کے ایک مشہور ہوٹل میں دعوت پر مدعو کیا۔ ہوٹل کا نام یاد نہیں رہا۔ طفیل صاحب نے فیض صاحب کو بھی مدعو کیا۔ جب دعوت کے وقت طفیل صاحب' غلام ربانی تاباں اور راقم التحریر کو لے کر ہوٹل میں پہنچے تو سامنے کی میز پر شورش اپنے احباب کے ہمراہ بات چیت میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُنھوں نے نعرہ لگایا کہ جگن ناتھ آزاد آ گیا ہے۔ گویا علامہ اقبال آ گئے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کو دیکھ لیا تو علامہ اقبال کو دیکھ لیا۔ یہ نعرہ سنتے ہی میری تو رُوح فنا ہو گئی —— جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ یہ نعرہ سُن کے ہوٹل میں موجود اکثر لوگوں نے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ چند ایک ملنے کے لئے بھی آ گئے لیکن شورش کے نعرے سے میرے تن بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی کہ ایک ذرّہ بے مقدار کہاں پھنس گیا۔ تھوڑی دیر میں یہ طوفان تھم گیا اور میری جان میں جان آئی۔

☆☆☆

شورش کا شمار اپنے وقت کے بہترین مقررین میں ہوتا تھا۔ اُن کے قلم میں شمشیر کی کاٹ تھی اور اُن کی تقریر میں اُس زمانے کے بم کے گولے۔ انگریز شورش کا دشمن نمبر ایک تھا اور ان کی تحریر اور تقریر انگریز ہی کے خلاف محوِ عمل رہتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شورش کی زندگی کا خاصا حصّہ جیل خانے میں گزرتا رہا۔ اُسی زمانے کی بات ہے کہ مجھے اُس کے دو شعر بہت پسند آئے تھے ۔

اُٹھے تو آسماں کی بلندی ہے ہمرکاب
بیٹھے تو فرشِ مہرِ درخشاں ترے لیے

بڑھنے لگے تو گردشِ دوراں ہے ہمقدم
ٹھہرے تو ذرّہ ذرّہ ہے رقصاں ترے لیے

معلوم نہیں ان اشعار میں شورش کا رُوئے سخن کس کی طرف ہے لیکن ان دو اشعار کی تضمین کرتے وقت میرا رُوئے سخن شورش ہی کی طرف تھا اور اسی تضمین پر میں اپنی یہ بات چیت

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ختم کرتا ہوں ۔

رقصاں ہے تیرے خُلق میں آہنگِ انقلاب
ہے نثر تیری لفظ و معانی کا انتخاب

دامن ترے کلام کا ہے دامنِ سحاب
اُٹھے تو آسماں کی بلندی ہے ہمرکاب

بیٹھے تو فرشِ مہر درخشاں ترے لیے

ہے بے نیاز اس سے کرم ہے کہ ہے ستم
یوں اعتبار اہلِ قلم ہے ترا قلم

اللہ رے تیری موجِ خطابت کا زیر و بم
بڑھنے لگے تو گردشِ دوراں ہے ہمقدم

ٹھہرے تو ذرّہ ذرّہ ہے رقصاں تیرے لیے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

پطرس بُخاری

پچھلے دِنوں میں اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کی طرف سے آئے ہوئے خطوط کی فائلیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک پطرس بخاری مرحوم کا خط سامنے آگیا جو اُنھوں نے اپنے اِس نیاز مند کو یونائٹڈ نیشنز (نیو یارک) سے لکھا تھا۔ اس خط کو دیکھ کے بخاری مرحوم سے ۱۹۵۴ء کی مُلاقات تازہ ہوگئی اور اُس ملاقات کے دو ایک واقعات یاد آ گئے۔ سوچا قارئین کو یہ واقعات سُنا دوں۔

۱۹۵۴ء کی بات ہے کراچی میں اپوا (ALL PAKISTAN WOMEN'S ASSOCIATION) کی جانب سے مشاعرہ تھا۔ ہندوستان سے جوشؔ ملیح آبادی اور راقم التحریر اُس مشاعرے میں مدعو تھے۔ شاید جگر صاحب بھی تھے لیکن ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا ہے۔ صدارت پروفیسر احمد شاہ بخاری نے کی۔ مشاعرے کا سارا انتظام شوکت تھانوی مرحوم نے کیا تھا۔ جہاں تک مُجھے یاد پڑتا ہے مُجھے اُس مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ شوکت تھانوی ہی کی جانب سے مِلا تھا۔

مشاعرہ LIVE براڈ کاسٹ ہو رہا تھا۔ (بُخاری صاحب جب کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ تھے اُس وقت آل انڈیا ریڈیو سے ساٹھ ساٹھ اور ستر ستر منٹ کے ڈرامے LIVE براڈ کاسٹ ہوا کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک براڈ کاسٹ ہونے سے پہلے پروگرام کو ریکارڈ کرنا ریڈیو والوں کی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نااہلیت کی دلیل تھی۔) بخاری صاحب کرسیِ صدارت پر رونق افروز تھے۔ (وہ کرسی ہی پر تشریف فرما تھے، مسند پر نہیں۔ باقی تمام شعرا ڈائس ہی پر تھے) شعر خوانی کی صورت یہ تھی کہ شاعر مائک کے سامنے آ کر کھڑا ہو کے اپنا کلام پڑھتا تھا۔

اپنی صدارتی تقریر میں بخاری صاحب نے کہا کہ یہ APWA کا مشاعرہ ہے اور شوکت تھانوی اس مشاعرے کے منتظم ہیں۔ وہ میرے پاس یہ فرمائش لے کر آئے تھے کہ میں اس مشاعرے کی صدارت کروں۔ میں اُن کی فرمائش ٹال نہ سکا اگرچہ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شوکت صاحب کا تعلق کس تھانے سے ہے۔ لیکن اُن کا تعلق کسی بھی تھانے سے ہو..... اے مانو! بہنو! بیٹیو! تھانے کی شوکت تم سے ہے....." سارا مشاعرہ قہقہہ زار بن گیا اور یہ سب کچھ نثر ہوا۔

میری باری پر "میرِ مشاعرہ" سیّد محمد جعفری نے میرا نام پکارا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر مائک پر گیا۔ بخاری صاحب کی کرسیِ صدارت مائک کے قریب ہی تھی، دائیں طرف۔ میں نے اُن کے قریب پہنچ کے ابھی آداب عرض کیا ہی تھا کہ وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کے مجھ سے ملے (صرف یہی نہیں کہ میں عُمر میں اُن سے بہت کم تھا، بلکہ ادب میں میرا رتبہ اُن کے سامنے صفر سے بھی کم تھا) اُنھوں نے مجھ سے میرا حال پوچھا، والد صاحب کا حال پوچھا۔ میں اس صورتِ حال سے نروس ہو رہا تھا۔ اور میں یہ تصوّر ہی نہیں کر سکتا تھا کہ مشاعرے کے دوران میں مائکروفون پر اس طرح بات چیت بھی کی جا سکتی ہے لیکن بخاری صاحب اس سے بے نیاز مجھ سے بات کر رہے تھے۔ میں نے بھی حوصلہ کر کے اُن سے پوچھ لیا کہ آپ کب تک کراچی میں ہیں۔ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے غالباً یہ کہا کہ میں کل یہیں ہوں لیکن مجھ پر چونکہ گھبراہٹ طاری تھی۔ اس لئے میں نے جلدی میں یہ سمجھا کہ وہ کہہ رہے ہیں میں کل جا رہا ہوں۔ چنانچہ میں اُن کی خدمت میں حاضر نہ ہوا۔ اِدھر صورت یہ تھی کہ وہ گھر پر میرا انتظار کرتے رہے اور اُسی رات یا دوسرے دن نیویارک واپس چلے گئے جہاں سے اُنھوں نے مجھے خط لکھا جس میں اُن کی عظمت اور دِلنوازی کی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تصویر نظر آ رہی ہے اور یہ خط ایک تبرک کے طور پر میرے پاس موجود ہے اور اس کی نقل نیچے درج کی جا رہی ہے:

یونائٹڈ نیشنز، نیویارک

۲۰ر دسمبر ۱۹۵۴ء

عزیزی و مشفقی۔ سلام شوق!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ مشاعرے میں آپ سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اگلے روز میں تمام دن آپ کا منتظر رہا۔ غریب خانے میں کئی سخن گو جمع تھے۔ بار بار آپ کا ذکر ہوتا تھا۔ اور سب آہٹ پر کان لگائے بیٹھے تھے۔ آپ آ جاتے تو بزم روشن ہو جاتی۔ بہر حال یار زندہ صحبت باقی۔ آپ کی دید نصیب ہوئی یہی غنیمت تھی اور پھر آپ کا کلام بھی آپ کی زبان سے سُن لیا۔ خدا آپ کو زندگی میں ہر طرح کامران کرے۔

''بیکراں'' کا انتظار ہے۔ نہ معلوم آپ نے ہوائی ڈاک سے بھیجی یا بحری ڈاک سے اگر کتاب بحری ڈاک سے آ رہی ہے تو چند ہفتے اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کتاب پہنچی تو شکریے کا خط لکھوں گا۔

بندۂ خاکسار

بخاری

اس کے ساتھ ہی مجھے بخاری صاحب کے ساتھ ایک اور ملاقات بھی یاد آ رہی ہے۔ یہ بھی کراچی ہی کی ملاقات ہے۔ جو ۱۹۵۳ء میں اُن کے ساتھ ہوئی۔ حضرت قبلہ عبدالمجید سالک بھی اُن دنوں کراچی میں مقیم تھے۔ کراچی کے اسی سفر میں اُنھوں نے میری درخواست پر میری طویل

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تمثیلی نظم "وطن میں اجنبی" کا دیباچہ لکھا تھا۔ چونکہ اُس دیباچے پر سالک صاحب کی لکھی ہوئی تاریخ ۲۵/اکتوبر ۱۹۵۳ء درج ہے اس لئے اُس ملاقات کے سن میں بھی کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

اَب مجھے یہ تو یاد نہیں کہ سالک صاحب جس مکان میں مقیم تھے وہ کس محلے میں یا کس سڑک پر تھا، لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ مکان دُوسری منزل پر تھا۔ (دُوسری منزل سے میری مُراد FIRST FLOOR ہے SECOND FLOOR نہیں) اور پانی وہاں تک نہیں پہنچتا تھا۔ جس کے باعث سالک صاحب کو خاصی تکلیف ہو رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر سالک صاحب نے بتایا کہ کسی کسی وقت پانی آجاتا ہے لیکن اِتنا نہیں کہ گھر کی ضروریات کے لئے مکتفی ہو سکے اور پھر ساتھ ہی اُنھوں نے بتایا کہ آج کل چند روز سے یہ تکلیف کم ہوگئی ہے کیوں کہ بخاری صاحب کراچی آئے ہوئے ہیں۔ اُن کا مکان گراونڈ فلور ہی پر ہے۔ اور وہاں پانی ہر وقت آتا رہتا ہے۔ وہ ہر روز پانی سے بھرے ٹین اپنی موٹر میں رکھ کر میرے لئے لے آتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے۔ یہ سنتے ہی میں سراپا اشتیاق بن کے اور تھوڑی دیر کے لئے وہیں رُک گیا کہ بخاری صاحب کا نیاز حاصل کر کے جاؤں گا۔ کچھ ہی دیر بعد دو ایک آدمیوں کے زینے پر چڑھنے کی آواز آئی۔ یہ بخاری صاحب اور اُن کے ڈرائیور تھے۔ جو ہاتھوں میں پانی کے برتن لئے مکان میں داخل ہوئے۔ (یہ میرے لئے ایک قابلِ دید نظارہ تھا۔) میں نے احتراماً کھڑے ہو کے آداب عرض کیا اور بخاری صاحب پانی کا برتن رکھ کے ابھی میری طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ سالک صاحب نے کہا "جگن ناتھ" "تم نے دیکھا کہ اُردو کے کتنے بڑے ادیب اور یو۔این۔او کے کتنے بڑے افسر ہمارے سامنے پانی بھرتے ہیں" بخاری صاحب نے فوراً مُجھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آزاد! ان کی تہذیب بھی دیکھ لو کہ اس کے باوجود یہ شرم سے پانی پانی نہیں ہوتے۔" (یہ واقعہ غالباً سالک صاحب کے مکان پر ایک سے زیادہ بار ہُوا ہوگا کیونکہ سالک صاحب کے لئے بخاری

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

صاحب ہر روز پانی فراہم کر رہے تھے۔ قریب قریب یہی واقعہ میں نے اپنے عزیز دوست شفیع عقیل کی ایک کتاب میں بھی دیکھا ہے۔)

ان دونوں ملاقاتوں کے علاوہ پطرس بخاری مرحوم سے میری چند ملاقاتیں اور بھی ہوئیں۔ جن میں سے ایک کا ذکر میری کتاب ''آنکھیں تر مٹیاں ہیں'' میں موجود ہے (مقالہ بعنوان ڈاکٹر عبدالحق) اور دو ایک ملاقاتوں کا ذکر جنہیں شاید ملاقات کہا بھی نہیں جا سکتا، میں نے اُس مقالے میں کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''یادِ یارِ مہرباں'' اور جو ''اُردو ادب'' کے فیض نمبر میں شائع ہوا ہے۔

ہاں ایک ملاقات اِس وقت اور بھی یاد آ رہی ہے اور وہ اُس زمانے کی ہے جب پطرس بخاری مرحوم گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ اُن کے دوست پنڈت ہری چند اختر اُن سے ملنے گئے اور میں اُن کے ساتھ تھا۔ اُس وقت تو پنڈت ہری چند اختر بھی مجھے جناب محرومؔ کے بیٹے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ میری اپنی تو کوئی حیثیت تھی نہیں اس لئے پطرس صاحب سے بات چیت کا کیا سوال۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کی فرمائش پر پنڈت ہری چند اختر نے اسلامیہ کالج کے طلبا کے لئے ڈراما لکھا تھا۔ پنڈت جی نے وہ ڈراما بخاری صاحب کو دکھایا۔ بخاری صاحب نے اسے اوّل سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اور انھیں ایسا پسند آیا کہ پنڈت جی سے کہنے لگے ''اختر، تم یہ ڈراما مجھے دے دو۔ گورنمنٹ کالج کے طلبہ اسے اسٹیج کریں گے۔'' اختر صاحب نے کہا ''یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ میں نے تاثیر کے لئے لکھا ہے۔'' بخاری صاحب نے فوراً کہا ''یار دے دو مجھے، تاثیر تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔'' فنِ گفتگو میں اختر صاحب کا جواب نہیں تھا۔ فوراً بولے ''بخاری! یہ تعلقات کی بات ہوتی ہے ورنہ تم میرا کیا بگاڑ لو گے۔'' بخاری یہ جواب سنتے ہی بے اختیار ہنس پڑے اور ڈراما فوراً اختر صاحب کو واپس دے دیا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

(۲)

یہ تمام واقعات تو "دیدہ" کی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن اب جب بخاری صاحب کا ذکر چل ہی پڑا ہے تو چند واقعات ایسے بھی سُن لیجئے جو میرے لئے شنیدہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے ہری چند اختؔر اسسٹنٹ آرگنائزر سانگ پبلسٹی تھے، بیمار تھے اور عرشؔ ملسیانی کے گھر میں فریش تھے۔

ایک دن کی بات ہے پطرسؔ بخاری جو اُس وقت کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ تھے۔ اور ڈاکٹر تاثیر جو ڈائرکٹر ریکلمنٹ اینڈ ایملائمنٹ تھے، اختؔر صاحب کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ حفیظؔ جالندھری اُس زمانے میں سانگ پبلسٹی آرگنائزر تھے اور اُن کا کام یہ تھا کہ ملک کے مختلف حصّوں میں جا کر مشاعروں میں شرکت کریں، مُلک میں جہاں جہاں ضروری سمجھیں مشاعروں کے انعقاد کا بھی فیصلہ کریں اور اپنے کلام کے ذریعے سے فوجی بھرتی کے لئے فضا ہموار کریں[1]۔

ابھی پطرسؔ اور تاثیرؔ وہاں موجود تھے کہ حفیظؔ جو اُسی دن کوہاٹ کے ایک مشاعرے سے واپس آئے تھے۔ اختؔر صاحب کی مزاج پرسی کے لئے آپہنچے۔ اُن کے بیٹھتے ہی بخاری

---

[1] یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ حفیظؔ صاحب کی نظمیں

میں تو چھورے کو بھرتی کرانے آئی رے

........فتح کا سہرا کس کے سر ہے؟

........اُن کی ماؤں کے سر سہرا ہے جن کے بیٹے جنگ میں ہیں

........المدد۔ المدد اے جذبۂ شوار پسند

........کلک بکو ڈرا اور بلند اور بلند

........شیروں کو آزادی ہے آزادی کے پابند رہیں

اُسی زمانے کی یادگار ہیں۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

صاحب نے کہا:

کہو حفیظ! آسام سے ہو آئے

تاثیر نے فقرہ مکمل کرتے ہو کہا:

خوب ٹی اے، ڈی اے بنایا ہوگا

حفیظ صاحب شگفتہ مزاج ہونے کے باوجود اکثر و بیشتر سنگ مزاجی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اُس وقت اُنھیں پطرس اور تاثیر کی فقرہ بازی بُری لگی اور کہنے لگے۔

"تم دونوں میرے حاسد ہو۔ تمھیں جلن ہے کہ تم کیمبرج اور آکسفورڈ سے ڈگریاں لے کر آئے ہو اور میں ساتویں درجے میں فیل تمھارے مقابلے میں کرسی پر بیٹھتا ہوں اور تمہارے برابر تنخواہ پاتا ہوں۔"

تاثیر نے کہا "دیکھو حفیظ، تم کس مزاج سے بالکل عاری ہو۔ ہم نے تو بر بنائے محبت ایک بات کہی اور تمھیں غصہ آ گیا۔ بھلا اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟"

بخاری نے بھی حفیظ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا "حفیظ، تاثیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم دونوں تمہارے دلی دوست ہیں اور تم سے محبت کرتے ہیں۔ تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔ دوستوں میں ایسی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔"

اب تاثیر کی باری تھی۔ اُنھوں نے بھی حفیظ کو منانے کی کوشش کی اور کہا "دیکھو حفیظ، تمہارا مجموعہ کلام "نغمہ زار" جب ۱۹۲۵ء میں چھپا تو میں نے اُس کا دیباچہ کس محبت سے لکھا اور پھر اُس کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ پطرس نے کس خلوص سے لکھا۔ ہم دونوں کے دلوں میں تمہارے لئے آج بھی وہی محبت اور خلوص ہے جو آج سے تیس سال پہلے موجود تھا۔"

حفیظ:۔ "تو گویا اب تم یہ بھی کہنا چاہتے ہو کہ تم نے ۱۹۲۵ء میں میری کتاب کا دیباچہ لکھ کر مجھ پر بڑا احسان کیا تھا۔ لے یار تاثیر تو بھی اپنا مجموعہ کلام مرتب کر اور بخاری تو نے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بھی جو کچھ لکھا ہے مرتب کرتا کہ میں اِن دونوں کتابوں کا دیباچہ لکھ کر تمہارا احسان بھی اُتار دوں۔"

اَب بخاری کی حسِ ظرافت اپنے جوبن پر آئی۔ بڑی متانت کے ساتھ حفیظ سے کہنے لگے۔

"حفیظ، بات سُن۔ ہم نے تمھاری کتاب کے دیباچے ۱۹۲۵ء میں لکھے تھے۔ تُو اَب ۱۹۴۵ء میں ہماری کتابوں کے دیباچے لکھنا چاہتا ہے۔ ہم نے مریل ٹٹو پر بازی لگائی تھی۔ ٹٹو ہمارا جیت گیا اور تُو آج جیتے ہوئے گھوڑے پر بازی لگانا چاہتا ہے۔"

اَب خدا جانے اُس وقت حفیظ صاحب کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔

(۳)

یہ باتیں تو بخاری صاحب کی ہو رہی ہیں۔ درمیان میں ذکر تاثیر مرحوم کا بھی آ گیا ہے۔ اس وقت ایک شگفتہ بات ڈاکٹر تاثیر کے سلسلے میں یاد آ رہی ہے چاہتا ہوں یہیں لکھ دوں، کیوں کہ یہ بات کئی بار یاد آئی اور حافظے سے محو ہو گئی۔ اب یاد آ گئی ہے تو لکھ ہی دُوں۔

ایک دفعہ ہری چند اختر سے ڈاکٹر تاثیر نے پوچھا۔

"یار پنڈت، سُنا ہے تو حفیظ کا شاگرد ہے۔"

اختر صاحب نے کہا "جی ہاں یہ بات تو صحیح ہے....."

تاثیر نے چھوٹتے ہی کہا۔

"میں تو تیری بڑی عزت کرتا تھا۔"

(۴)

زمانہ ہوا ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ایک لطیفہ سنایا تھا۔ اُنھوں نے تو اسے واقعہ کہا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تھا۔ لیکن ہوگا لطیفہ[1] ہی۔ کہنے لگے:

"ایک بار میں اور احسان دانش ریل میں اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر میرے ایک دوست اسی ڈبے میں داخل ہوئے۔ میں نے اُن سے احسان دانش کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ" آپ ہیں اُردو کے مشہور شاعر، مصورِ فطرت، شاعرِ مزدور، حضرت احسان دانش کاندھلوی۔" اُس دوست نے پوچھا "وہی جو مزدوروں کے بارے میں نظمیں لکھتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا "جی ہاں وہی۔" دوست کہنے لگا "خدا کی قسم ان کی نظمیں پڑھ کے یہ جی چاہتا ہے کہ صبح کو اُٹھتے ہی ہر مزدور کے سر پر سو جوتے لگائے جائیں۔"

بخاری نے یہ لطیفہ سنتے ہی کہا کہ:

"ایک بار میں اور حفیظؔ جالندھری اکٹھے سفر کر رہے تھے کہ ایک اسٹیشن پر میرے ایک دوست اُسی ڈبے میں داخل ہوئے جس میں ہم دونوں پہلے سے موجود تھے۔ میں نے یہ کہہ کر حفیظؔ کا تعارف اُن سے کرایا۔

"......آپ ہیں ہندوستان کے نامور شاعر، فردوسیِ اسلام، مصنفِ شاہنامہ اسلام، نغمہ زار و سوز و ساز کے مصنف ملک الشعراء حضرت ابوالاثر حفیظؔ جالندھری"۔ میرے دوست نے انتہائی عالمِ اشتیاق میں ہاتھ بڑھا کے اُن سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا آپ جالندھر کے رہنے والے ہیں......السلام علیکم۔"

(۵)

پروفیسر بخاری گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے اور ڈاکٹر تاثیرؔ اسلامیہ کالج لاہور

---

[1] راقم التحریر کے نزدیک یہ اس لئے واقعہ نہیں ہو سکتا اور محض لطیفہ ہی ہو سکتا ہے کہ تاثیر اور احسان دانش کے ریل کے ایک ہی درجے میں سفر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاثیر صاحب ریل کے اوّل درجے کے علاوہ کسی اور درجے میں سفر نہیں کرتے تھے اور برادر محترم احسان دانش نے کبھی تیسرے درجے سے اوپر کے درجے میں جھانک کے نہیں دیکھا ہوگا۔ راقم التحریر اور احسان دانش نے مشاعروں میں شرکت کے لئے بیسیوں بار اکٹھا سفر کیا ہوگا اور تیسرے درجے سے اوپر کا ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ (ج۔ ن۔ ا)

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دونوں میں اس موضوع پر بات چیت شروع ہوگئی کہ کون سا کالج طلبہ کو صحیح انداز کی معیاری تعلیم دے رہا ہے۔اُن دنوں اسلامیہ کالج کھیل کے میدان میں پنجاب بھر کے کالجوں میں سب سے آگے تھا۔اور گورنمنٹ کالج تعلیمی نتائج کے اعتبار سے اوّل نمبر پر تھا.....بخاری نے تاثیر سے کہا کہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم پہلوان پیدا کریں جو علم سے بالکل بے گانہ ہوں۔تعلیم کا مقصد کچھ اور ہے اور اگر تعلیم انسان کے اندر اُس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پوری طرح اُجاگر نہیں کرتی تو یہ بات بالکل بے کار ہے کہ وہ مگدر اُٹھائے اُٹھائے پھریں اور کھیل کے میدان میں چھلانگیں لگاتے رہیں۔تاثیر نے جواباً کہا تعلیم کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ ہم تپ دق کے مریض پیدا کریں اور وہ کتابی علم جاننے کے سوا کسی کام کے نہ ہوں۔اس طرح دونوں دوست ایک دوسرے پر پھلجھڑیوں کے وار کرتے رہے۔آخری جملہ بخاری کا تھا جس نے تاثیر کو لاجواب کر دیا۔بخاری نے کہا۔"اچھا یار تاثیر! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ذرا تم ہی اس پر روشنی ڈالو۔ہم اپنے کالج میں لیکچر دینے کے لئے تمھیں بلاتے ہیں اور تم اپنے کالج میں ہمیں بلاتے ہو۔ایک بات میرے لئے بڑی حیرت کا باعث ہے اور اُس کا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔میں جب تمہارے کالج میں لیکچر دینے کے لئے جاتا ہوں اور طلبا سے خطاب کرتے ہوں کہتا ہوں! "GENTLEMEN" تو وہ مسکرا دیتے ہیں۔معلوم نہیں کیوں۔"

مدّت کی بات ہے بخاری اور تاثیر لندن کے سفر پر گئے۔وہاں دونوں ایک ہی ہوٹل میں مقیم تھے۔صبح کو اخبار آیا تو تاثیر اخبار پڑھنے بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر میں بخاری کی آنکھ کھلی تو اُنھوں نے کہا" بھئی اخبار ہمیں دو ذرا ہم بھی دیکھیں۔" تاثیر نے کہا" یہ انگریزی کا اخبار ہے تمہارے کام کا نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد تاثیر نے اخبار پڑھ کے رکھ دیا اور انگریزی کی کوئی کتاب لے کے اُسے پڑھنے بیٹھے ہی تھے کہ بخاری اُٹھے اور ڈکشنری لا کے تاثیر کے سامنے رکھ دی۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

(۶)

ایک دفعہ کا ذکر ہے نہ مہینہ یاد ہے نہ سن۔ اتنا یاد ہے کہ لائل پور میں مشاعرہ تھا۔ حفیظ صاحب اور ڈاکٹر تاثیر دونوں مدعو تھے۔ والدِ محترم بھی مدعو تھے۔ وہ راولپنڈی سے پہلے لاہور آئے۔ اس لیے کہ راقم التحریر بھی مدعو تھا اور والد صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ وہ اور میں اکٹھے لاہور سے لائل پور جائیں گے۔ ریل کی روانگی سے خاصا پہلے والدِ محترم کی اور میری ملاقات پلیٹ فارم ہی پر حفیظ صاحب اور تاثیر صاحب سے ہو گئی۔ بات چیت کے دوران میں تاثیر صاحب کے سفید بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے والد صاحب نے اُن سے کہا کہ تاثیر صاحب آپ اب بوڑھے ہو رہے ہیں۔ تاثیر صاحب نے کہا جی ہاں محروم صاحب' دل کا رنگ بالوں میں آ گیا ہے۔ اس پر میرے والد نے فوراً سوال کیا اور بالوں کا رنگ؟ اس پر تاثیر صاحب اور حفیظ صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور تاثیر صاحب سے خطاب کرتے ہوئے حفیظ صاحب نے کہا کہ تاثیر' محروم صاحب نے تمھیں جواب دینے کے قابل نہیں چھوڑا۔ 'ہر فرعونے راموسیٰ' اس پر پھر ایک قہقہہ لگا۔

□□□

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کالی داس گپتا رضا

از شمار دو چشم یک تن کم
وز حساب خرد ہزاراں بیش

کالی داس گپتا رضا کا انتقال پُر ملال صرف اُردو دُنیا ہی کے لیے ایک حادثہ عظیم نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ساری ادبی دُنیا کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ کالی داس گپتا ایک باکمال شاعر، مستند نقاد اور معتبر محقق تھے۔ غالب اُن کا خاص موضوع تھا اور اُنھوں نے غالب پر اتنا معیاری کام کیا کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بھی ماہر غالبیات کے لقب سے شہرت پائی۔ اُن کے انتقال کے بعد ہندوستان کے اخبارات اور جرائد نے تو کالی داس گپتا رضا نمبر نکالے ہیں، پاکستان میں بھی اُن کی یاد میں اخبارات اور رسائل نے بہت کچھ لکھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر مُعین الرحمٰن نے کالج کے اُردو سہ ماہی کا ایک بہت خوبصورت اور بہت معیاری کالی داس گپتا رضا نمبر شائع کیا۔ پروفیسر مُعین الرحمٰن ہم اہلِ ہندوستان کے ولی شکریے کے مستحق ہیں۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کالی داس گپتا رضا سے میری صرف ایک ہی ملاقات ہوئی اور وہ بھی یوں کہ نیشنل کونسل فار پروموشن آف اُردو کا میں بھی رُکن ہوں اور وہ بھی رُکن تھے۔ کونسل کا سالانہ جلسہ تھا۔ کرسیوں پر حسبِ دستور تمام ممبروں کے نام درج تھے۔ میں آیا تو اپنے نام کی خالی کرسی پر بیٹھنے لگا اور اِس بات سے بے خبر رہا کہ میرے دائیں طرف کالی داس گپتا تشریف فرما ہیں اور بائیں طرف فلمی دُنیا کی مشہور شخصیت گلزار صاحب۔ میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ صدر صاحب تشریف لے آئے اور جلسہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے اِبتدائی کلمات میں اکثر و بیشتر حاضرین کا تعریفی الفاظ میں ذکر کیا یا ایک طرح سے تعارف کرایا اور ہم تینوں کا' گپتا صاحب کا، راقم التحریر کا اور گلزار صاحب کا' نام لیا تو میں حیرت زدہ رہ گیا کہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ اِن عظیم ہستیوں کے درمیان میں بیٹھا ہوں۔ اُسی وقت میں نے اِن دونوں نامور شخصیتوں کے ساتھ ہاتھ ملایا اور بات آداب، آداب ہی تک محدود رہی کیونکہ جلسے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔

اِس کے بعد اِن دونوں حضرات سے دوبارہ مُلاقات نہ ہو سکی۔ رضا صاحب تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ اب موت پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ موت تو برحق ہے۔ جو اِس دُنیا میں آیا ہے اُسے جانا ہی ہے۔

موت سے کس کو رُستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

لیکن بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے اِنتقال سے ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایسا خلا ہوتا ہے کہ پُر نہیں ہو سکتا۔ رضا صاحب کے اِنتقال سے ہر ایک پُر نہ ہونے والا خلا اُردو دُنیا میں پیدا ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں نے اُوپر لکھا ہے مُلاقات اگرچہ مختصر ہونے کے باوجود مسرت آمیز تھی لیکن باہمی خط و کتابت کا سلسلہ اِس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ ہم اپنی اپنی تصنیفات و

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

تالیفات بھی ایک ایک' دو دو کی صورت میں ڈاک کے ذریعے سے تحفۃً بھیجتے رہے اور آج صورت یہ ہے کہ اُن کی تمام تصنیفات و تالیفات میری لائبریری میں موجود ہیں اور غالباً میری تمام تصنیفات و تالیفات اُن کی لائبریری میں موجود ہوں گی۔

ماہرِ غالبیات کے طور پر تو ان کا کام لاجواب ہے' داغ اور چکبست پر بھی جتنا کام اُنھوں نے کیا ہے شاید اور نقادوں اور محققین نے نہیں کیا ہوگا۔ میں نے اپنے چند مقالات میں اُن کے کام کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ان کے کام کی اگر میں تفصیل بیان کرنا چاہوں تو یہ مقالہ جسے میں نے محب مکرم سردار ہرمجن سنگھ' پروپرائٹر ماہنامہ ''رہنمائے تعلیم'' (دہلی) کی فرمائش پر (انتہائی مصروفیت کے باوجود) لکھنا شروع کیا ہے بہت طویل ہو جائے گا اور اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ شاید نامکمل رہ جائے۔ اس لیے ان کے زندۂ جاوید کام کی طرف محض چند اشارے ہی کروں گا۔ اُن کے شعری مجموؤں کی تعداد ۹ یا ۱۰ ہے۔ نثری تصنیفات اور تالیفات کی تعداد ۵۰ تک پہنچتی ہے۔ اور مقامِ مسرّت ہے کہ خود رضا صاحب پر بھی ان کے قدردانوں نے کام کیا ہے۔ چند نام جو مجھے یاد آرہے ہیں یہ ہیں: صابر دت، عابد حسین عابد، ظفر ادیب، ساحر شیوی، بلراج ورما' اور ڈاکٹر تارا چند رستوگی۔ ان پر چھوٹی یا بڑی کتاب لکھ کر ان کی زندگی میں معیاری کام تو بعض اور حضرات نے بھی کیا ہے لیکن بہت سے نام مجھے یاد نہیں آرہے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد پروفیسر معین الرحمٰن کے سہ ماہی رضا' گپتا نمبر نکلنے کا ذکر میں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ہفتہ وار ''ہماری زبان'' کا ایک ضخیم کالی داس گپتا رضا نمبر نکالا ہے۔ ''رہنمائے تعلیم'' کا کالی داس گپتا رضا نمبر زیرِ ترتیب ہے۔ میرا خیال ہے سہ ماہی ''اسباق'' پونا کا بھی رضا نمبر شائع ہوگا۔ میں ان خاص نمبروں کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں اور جن مصنفین یا مدیرانِ محترم کے نام اُوپر آئے ہیں اُن کی خدمت میں شیخ سعدیؒ کی مندرجہ ذیل نصیحت پر عمل کرنے کے لیے مبارک باد بھی پیش کرتا ہوں اور شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

تا بماند نام نیکت یادگار

بات یہ ہے کہ مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری اور کالی داس گپتا رضا کے بعد دیگرے اس قدر مختصر وقفوں کے ساتھ ہم سے جُدا ہو گئے ہیں کہ اُن کی جُدائی اور اُن کی یادوں نے ''سنگ آمد و سخت آمد'' کی صورت اختیار کر لی ہے:

ع - خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ڈاکٹر مولانا عبدالحق

(جنوبی ہند کے سرسیّد)

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اور یہ نام افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کا ہے جن کی ذاتِ بابرکات پر ہندوستان جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ اس عظیم شخصیت پر ڈاکٹر اقبال احمد نے تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ میں نے اس تحقیقی مقالے کو ایک نظر دیکھا ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ صرف ایک عظیم شخصیت اور اُس کے کارناموں سے متعلق ہی مقالہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہندوستان کی اُس تہذیب کے انوار بھی چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں جس کی تشکیل میں مختلف اقوام کا بالخصوص ہندوؤں اور مسلمانوں کی کئی نسلوں کا خونِ جگر صَرف ہوا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم اسی تہذیب کے گرویدہ اور اسی تہذیب کے ایک نمائندے تھے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ اسی تہذیب کا مرقع تھے تو غلط نہ ہوگا۔ علم و فضل، صدق و

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

صفا، خلوص و حلم، تحمل، ہمدردی، بردباری یہ سب اسی تہذیب کے مختلف ابعاد ہیں اور یہ سب ابعاد افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کی ذات میں سما کر اس طرح یک جان ہو گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار تھا۔ وہ علم و فضل کا ایک بحرِ بیکراں تھے اور ڈاکٹر اقبال احمد نے اس بحرِ بیکراں کو ایک کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ ہر اعتبار سے ایک کامیاب کوشش ہے لیکن ہے تو کوشش ہی کیوں کہ ڈاکٹر عبدالحق کی ذاتِ ستودہ صفات کا ذکر ایک تحقیقی مقالے کا نہیں بلکہ کئی تحقیقی مقالات کا متقاضی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر اقبال احمد نے جو چراغ روشن کیا ہے وہ متعدد چراغوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

مجھ سے جب ڈاکٹر اقبال احمد نے اور پھر ہاجرہ بہن نے اس مقالے کا پیش لفظ یا حرفِ اوّل لکھنے کی فرمائش کی تو مجھے اس فرمائش کی تعمیل میں قدرے تامّل ہوا کیونکہ ایک ذرہ خورشید کی تعریف میں لب کشا ہونا چاہے تو کہاں تک اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکے گا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے اس معاملے میں ایک سعادت بھی تو حاصل ہے اور وہ یہ کہ میں ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا نیاز بھی تو حاصل کر چکا ہوں۔ اس بات کو اگرچہ پینتالیس برس ہونے کو آئے ہیں لیکن یہ کل ہی کی بات نظر آتی ہے۔ دہلی سے مدراس پہنچنے پر اُن کے دولت کدے پر اس خاکسار کی حاضری، اُن کی طرف سے دعوت، اُس دعوت میں اُن کی دلنوازی کا سلیقہ اور اُن کی کُل افشانیِ گفتار ماحول کو شگفتہ تر بنا رہی تھی اور میرا ذہن بار بار علامہ اقبال کے اس مصرعے کی جانب جا رہا تھا:

ع - مُسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

یہاں اگر اس ملاقات کا ذکر میں اپنے سفرنامے "جنوبی ہند میں دو ہفتے" کے ایک اقتباس کے ذریعے سے کروں تو غالباً نامناسب ہوگا:

"اسٹیشن سے ہم لوگ سید عبدالوہاب بخاری کے مکان پر پہنچے
میرے قیام کا انتظام نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ آج کی دعوت

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ڈاکٹر مولانا عبدالحق پرنسپل پریذیڈنسی کالج مدراس کی طرف سے
ہے اور وہ اپنے دولت کدے پر منتظر ہیں۔ سامان وغیرہ وہیں
اُتارا گیا۔ اور اشرف صاحب اور میں اُسی گاڑی میں ڈاکٹر
صاحب کے وہاں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے تپاک سے ملے۔
سفر کی کیفیت دریافت کی۔ والدِ محترم کا مزاج پوچھا اور بہت
دیر تک والد، ڈاکٹر اقبال، شیخ سر عبدالقادر اور مخزن کے دورِ اوّل
کا ذکر کرتے رہے۔"

اس کے بعد مشاعرے میں جو اُن کی زیرِ صدارت منعقد ہوا اُن کی شگفتہ بیانی کے اور جوہر کھلے۔ گویا وہ اپنے علم کے بوجھ تلے دبے ہوئے نہیں تھے بلکہ علم نے اُن کو شگفتہ مزاجی اور تازہ کاری کا ایک مُرقع بنا دیا تھا۔ اُنھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں اُردو شاعری کی ہر دور کی تدریجی ترقیوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا۔ مشاعرے اور ان کی افادیت پر ایک نظر ڈالی اور مشاعرے کی کاروائی شروع کی۔ اوّل سے آخر تک میں نے دیکھا کہ اُن کے شگفتہ جُملے مشاعرے میں جان ڈال رہے ہیں اور اُن کا سنجیدہ اور کبھی کبھی مزاحیہ اندازِ بیان ایک خاص کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

مشاعرے کے دُوسرے روز اُردو زبان اور اُردو ادب کے موضوع پر اسی کالج میں میری تقریر تھی۔ یہ جلسہ بھی ڈاکٹر مولانا عبدالحق ہی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ یہاں بھی صدارتی تقریر اُن کے علم و فضل کے اَنوار لُٹا رہی تھی اور سچ پوچھیں تو اُس سفر کا حاصل ڈاکٹر عبدالحق سے ملاقات تھی۔

میری مذکورہ تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ اگر ممکن ہو تو میں اگلے دن اُن کے ساتھ کرنول چلوں۔ کرنول میں ایک کالج ہے عثمانیہ کالج، اس کا قیام مولانا عبدالحق ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ صرف اس کالج ہی پر کیا موقوف ہے۔ جنوبی ہند میں اُنھوں نے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اس طرح تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ آج تک "جنوبی ہند کے سرسیّد" کے نام سے مشہور ہیں۔

اُنھوں نے کرنول چلنے کی فرمائش اس محبت بھرے انداز سے کی کہ میں انکار نہ کر سکا اور ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ جب دو ایک روز بسر کرنے کا موقع مل رہا تھا تو انکار کرنے کا کیا سوال۔ اس ہم سفری کی رُوداد تو میں اپنے سفر نامے "جنوبی ہند میں دو ہفتے" میں بیان کر چکا ہوں لیکن ایک بات جس کا ذکر مذکورہ سفر نامے میں نہیں ہے اُس کا ذکر یہاں کرنا چاہوں گا کہ اُس سے ڈاکٹر مولانا عبدالحق مرحوم کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

ریل کے جس ڈبے میں ہم دونوں کا ریزرویشن تھا وہ فرسٹ کلاس کا (یا سیکنڈ کلاس کا[1]) تھا۔ ظاہر ہے اُس میں دو ہی برتھیں تھیں۔ جب گپ شپ کے بعد سونے کا وقت ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نیچے کی برتھ آپ کے لئے ہے اور اُوپر کی برتھ پر میں سوؤں گا۔" اب اس پیش کش کو قبول کرنا میرے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں ایک لڑکا تھا، اُوپر کی برتھ پر جانا میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب میرے بزرگ تھے، محترم بزرگ۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اُوپر کے برتھ پر جانے کی زحمت کریں اور میں آرام سے نیچے کی برتھ پر سوؤں لیکن اُنھوں نے میری بات نہ مانی اور نیچے کی برتھ میرے سُپرد کر کے خود اُوپر کی برتھ پر جا کر سو گئے۔

اور اس وقت جب کہ یہ پینتالیس برس پہلے کی رُوداد بیان کر رہا ہوں مصحفی کا یہ شعر میرے حافظے میں چمک رہا ہے ؎

---

[1] یہاں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں یہ ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اُس وقت کا سیکنڈ کلاس آج کے فرسٹ کلاس سے کہیں بہتر ہوتا تھا اور اگر آج کے سیکنڈ کلاس (اے سی) میں سے اے سی کی سہولیت خارج کر دیں تو وہ سیکنڈ کلاس اس سے بہتر ہوتا تھا۔ ہاں آج کا فرسٹ (اے سی) اگر اے سی کے بغیر ہو تو اُس سیکنڈ کلاس کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

☆

ڈاکٹر اقبال احمد نے اپنے مقالے کی ابتداء عرب و ہند کے تعلقات سے کی ہے اور عرب کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات کی ابتداء چونکہ جنوبی ہند سے ہوتی ہے اس لیے ڈاکٹر عبدالحق کے متعلق مقالہ جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اُجداد کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا' اس امر کا متقاضی تھا کہ اس کی ابتداء عرب و ہند کے تعلقات سے ہو۔

ڈاکٹر عبدالحق کے والدِ محترم مولانا محمد عمر کے علم و فضل کا مفصل ذکر اس مقالے کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کے علمی، ادبی اور تعلیمی کارنامے بھی بڑی حد تک شمس العلماء مولانا محمد عمر کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں۔

اس مقالے کے بارے میں یہ کہتے ہوئے مجھے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال احمد نے معروضی رویے اور معروضی اندازِ بیان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جس کی بدولت مقالہ صحیح معنی میں ایک تحقیقی مقالے کے طور پر قاری کے سامنے آ رہا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ کہیں بھی گمان نہیں ہوتا کہ مقالہ "ہیرو ورشپ" کی ایک تصویر بن کر رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی صحیح تاریخِ ولادت کا تعین ڈاکٹر اقبال احمد کی دقتِ نظری اور دیدہ ریزی کی ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ بھی مصنف نے مولوی صاحب مرحوم کی زندگی کے جس پہلو پر بھی قلم اُٹھایا ہے مثلاً تعلم و تعلیم کے سلسلے میں غیر ملکوں کا سفر' اُس میں خاصی احتیاط سے کام لیا ہے اور یہ ایک ریسرچ اسکالر کی بڑی خوبی ہے۔

مستند اہلِ قلم مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر رضی الدین احمد، شاہ معین الدین احمد ندوی، آغا حیدر حسن مرزا، ڈاکٹر سید عبداللطیف اور غلام ربانی تاباں ایسی معتبر ہستیوں کے حوالوں کی بدولت مقالے کی قدر و قیمت

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔

تعلیم کے میدان میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات سے متعلق ڈاکٹر اقبال احمد نے جو باب مرتب کیا ہے وہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس بات کی بڑی ضرورت تھی کہ جنوبی ہند میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جو خدمات انجام دی ہیں اور جس جانفشانی سے کام لیا ہے اُس کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے۔ ڈاکٹر اقبال احمد نے یہ فرض بخوبی انجام دیا ہے۔

مجھے اس مقالے ہی سے یہ بات پہلی بار معلوم ہو رہی ہے کہ مدراس میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کی شاخ سب سے پہلے افضل العلماء مولوی عبدالحق ہی نے ۱۹۲۸ء میں قائم کی۔ ۱۹۲۸ء میں میری عمر نو برس کی تھی اور میں اُس وقت انجمن ترقی اُردو کے نام سے بھی آشنا نہیں تھا۔ آج "بہتر" برس کی عمر میں جب میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کی صدارت کے فرائض انجام دے رہا ہوں یہ جان کر مجھے کتنی مسرت ہو رہی ہے کہ مولوی عبدالحق مرحوم کے ساتھ میرے نیاز مندانہ مراسم کے علاوہ اور درس تدریس کے کام کی ہم مشربی کے علاوہ ایک اور رشتہ بھی ہم دونوں میں موجود ہے اور وہ ہے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے ذریعے سے اُردو کی خدمت کا رشتہ ——— میری اس مسرت کا اندازہ زیرِ نظر تحریر کے قارئین بآسانی نہیں کر سکیں گے۔

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کے نام ڈاکٹر مولوی عبدالحق (معتمدِ اعلیٰ انجمن ترقی اُردو پاکستان) کے خطوط نے اس تحقیقی مقالے کی افادیت اور دلچسپی دونوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ جن حضرات کو ان دونوں شخصیتوں سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے ہیں وہ ڈاکٹر عبدالحق کے اس فقرے کی بے ساختہ داد دیں گے:

> "آپ میرے ہم نام ہی نہیں ہیں، میرے ہم قدر اور ہم جسم
> بلکہ ہم رنگ و ہم ذوق بھی ہیں....."

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

خود افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کی نثر نگاری ایک خصوصی اور امتیازی رتبے کی حامل ہے۔ ڈاکٹر اقبال احمد نے مولوی صاحب کی وہ تقریر جو انھوں نے امجد حیدرآبادی کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقعے پر بطور صدر کے فرمائی تھی اپنے مقالے میں شامل کر کے مولوی صاحب کی تحریر دلپذیر کا بھی گویا ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ اس سے مقالے کے حُسن میں بھی اضافہ ہو گیا ہے اور وقار میں بھی۔

مقالہ نگار نے اس مقالے کی تکمیل میں جو محنت صرف کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ مُجھے یقین ہے کہ وطنِ عزیز کی ایک عظیم شخصیت کے بارے میں یہ مقالہ جو صاف ستھری، سلیس اور رواں دواں زبان میں لکھا گیا ہے مُلک کے علمی اور ادبی حلقوں میں شرف پذیرائی حاصل کرے گا۔ ڈاکٹر اقبال احمد نے یہ مقالہ مرتب کر کے صرف ایک ادبی خدمت ہی انجام نہیں دی ہے بلکہ سماجی اور قومی خدمت بھی انجام دی ہے جس کے لیے وہ مستحق مبارک باد ہیں۔

۷ر نومبر ۱۹۹۳ء

□□□

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

مجروح سُلطان پوری

''کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو''

ٹھیک سے مہینہ اور سال تو یاد نہیں ہے لیکن دُوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ غالباً ۱۹۴۳ء میں ایک بہت بڑا جنگی مشاعرہ امرتسر میں منعقد ہوا۔ یہ تھا تو حکومتِ برطانیہ کی امداد کے لئے (یا دُوسرے لفظوں میں اُس وقت کی حکومتِ ہند کی امداد کے لئے) لیکن دعوت ناموں میں یہ لکھا گیا تھا کہ جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہیوں کے علاج اور مرہم پٹی کے لئے یہ مشاعرہ منعقد کیا جا رہا ہے۔

یہ ہر اعتبار سے ایک بڑا مشاعرہ تھا۔ اس میں بڑے شعراء، مثلاً جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، تاجور نجیب آبادی، حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، احسان دانش، روش صدیقی، فیض احمد فیض، ہری چند اختر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور نفیس خلیلی کے علاوہ نئے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

شعراء بھی خاصی تعداد میں تھے مثلاً راقم التحریر، راز مرادآبادی، جمیل الدین عالی، پرشوتم لال ضیا، کرپال سنگھ بیدار، مجروح سلطانپوری، اور شکیل بدایونی۔ شعراء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ باقی نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔ (ہاں یاد آیا' ماہر القادری بھی شریک تھے۔ یہ سینئر شعراء سے جونیئر تھے اور جونیئر شعراء سے سینئر تھے۔)

اس مشاعرے کے بارے میں پورا ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے لیکن میں اپنی بات چیت ذکرِ مجروح ہی تک محدود رکھوں گا۔ مجروح کے ذکر سے پہلے یہ بیان کردوں کہ اُس وقت ای۔ پی۔ مون (E.P.Moon) نامی ایک انگریز امرتسر کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ یہ مشاعرہ انھی کے حکم سے منعقد ہوا تھا اور اس کا سارا انتظام ریاض قریشی نامی ایک سخن فہم اور سخن ور شخصیت کے سپرد تھا۔ ریاض قریشی ریلوے مجسٹریٹ تھے۔ اُنھوں نے شعراء کے استقبال میں ایک طویل نظم کہی تھی جس میں مدعو ہونے والے تمام شعراء کے نام یا تخلص درج تھے۔ میرے والدِ محترم اُس مشاعرے کے لئے مدعو تھے لیکن وہ بہ وجہ علالت مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے تاہم ریاض قریشی نے جو نظم شعراء کے استقبال میں پڑھی اُس میں یہ شعر بھی پڑھ دیا ؎

جلوہ گر اس بزم میں محروم ہے
جس کے شعروں کی دکن تک دھوم ہے

اس پر اکثر شعراء نے میری طرف دیکھ کر آنکھوں کے اشارے سے پوچھا کہ محروم صاحب کہاں ہیں۔ میں نے بھی باندازِ خموشی اُنھیں بتا دیا کہ وہ علیل ہیں اور راولپنڈی میں ہی ہیں۔ اُس زمانے میں مشاعرے میں باتیں کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ معیوب کیا؟ شعراء مشاعرے میں ایک دُوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہی نہیں تھے اور پوری توجہ سے شاعر کا کلام سُنتے تھے۔ ریاض قریشی صاحب شاید مجروح کو کہیں پہلے سُن چکے تھے۔ ان کے بارے میں اُنھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

بلبلِ باغِ سخن مجروح ہے
اس کا نغمہ شاعری کی رُوح ہے

راقم التحریر کے بارے میں جو شعر اُنھوں نے پڑھا وہ ایک مدّت تک راقم التحریر کو یاد تھا لیکن اب حافظے میں نہیں ہے۔ ہاں حفیظ صاحب کے بارے میں اُنھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

دل میں گھر کرتی ہے آوازِ حفیظ
کس قدر ہے دلنشیں سازِ حفیظ

مشاعرے کے بعد حفیظ صاحب کے بعض مخالفین یہ کہہ کر مذکورہ شعر دہراتے رہے کہ دیکھئے' حفیظ کی آواز کی تعریف کی ہے' کلام کی تعریف نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔

ریاض قریشی فی البدیہہ شعر کہنے میں بھی ماہر تھے۔ اگر کسی شاعر کا نام اُن کی مذکورہ نظم میں نہیں ہے تو فی البدیہہ شعر کہہ کر وہ نظم میں شامل کرتے جاتے تھے۔

جیسا کہ شاعروں کا طریقہ ہے سب سے پہلے ہم مبتدی شعراء کو باری باری شعر خوانی کی دعوت دی گئی۔ جب سب کے نام ہی یاد نہیں تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ کس کو پہلے اور کس کو بعد میں بلایا گیا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ جب مجروح نے اپنا کلام پڑھا تو سماں باندھ دیا۔ یہ بھی یاد ہے کہ مجروح نے پہلے ایک غزل پڑھی۔ غزل بھی بہت عمدہ اور پھر مجروح کی اُس زمانے کی آواز۔ مکرر مکرر کے شور میں مجروح نے اب کے ایک گیت ''گائے جا پیہے گائے جا'' شروع کیا۔ اور مشاعرہ لوٹ کے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی نشست پر آ کے بیٹھ گئے۔ نشست یوں تھی کہ جگر صاحب اور مولانا تاجور نجیب آبادی ساتھ ہی ساتھ بیٹھے تھے۔ میں مولانا تاجور کے پیچھے بیٹھا تھا اور مجروح جگر صاحب کے پیچھے۔ اُس زمانے میں دستور یہی تھا کہ مشاعرے میں شاگرد اُستاد کے پیچھے بیٹھتا تھا۔ اور میں چونکہ تاجور صاحب کا شاگرد تھا (بلکہ ہوں) تو میں اُن کے پیچھے اور مجروح صاحب کے جگر صاحب کے پیچھے بیٹھنے سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

مجروح صاحب جگر صاحب کے شاگرد ہیں لیکن میرا یہ اندازہ غلط تھا۔ مجروح' جگر صاحب کے شاگرد نہیں تھے۔ بلکہ مجروح جگر صاحب کے ایک جونیئر دوست تھے۔

مشاعرہ رات کے کوئی ڈھائی تین بجے (یا یوں کہئے کہ صبح کے ڈھائی تین بجے) ختم ہوا اور باقیات الصالحات سے فارغ ہو کے سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ اس مشاعرے میں مجروح صاحب کو دیکھنے اور سننے کے علاوہ بات چیت نہ ہو سکی۔ لیکن میں ان کے کلام اور خوشنوائی کا ایک پائیدار تاثر لے کر وہاں سے روانہ ہوا۔ اُس زمانے میں سینئر شعراء جونیئر شعراء کی حوصلہ افزائی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جونیئر شعراء کے اچھے اشعار پر سینئر شعراء فراخ دلی کے ساتھ داد دیتے رہے۔

اس مشاعرے کے کچھ مدت بعد گورداس پور میں ایک مشاعرہ منعقد ہُوا۔ یہ ایک سالانہ مشاعرہ ہُوا کرتا تھا جس کا اہتمام گورداس پور کے دو دوست محکم سنگھ سونی اور محمد شفیع مشترکہ طور پر کیا کرتے تھے۔ اس مشاعرے میں مجروح صاحب اور راقم التحریر دونوں مدعو تھے۔ یہ مشاعرہ امرتسر کے مشاعرے کی طرح اتنا بڑا نہیں تھا کہ ڈور ڈور تک ہوٹل کے کمرے بھی شعراء سے پُر ہوں اور لان میں شامیانے لگے ہوں اور پتا بھی نہ چلے کہ کون سا شاعر کس کمرے یا کس شامیانے میں مقیم ہے۔ گورداس پور میں میرا اور مجروح صاحب کا قیام محمد شفیع کے مکان ہی پر تھا۔ یہ ایک دُوسرے سے ملنے اور بات کرنے کا بہت عمدہ موقع تھا۔ قیام تو وہاں دو دن کا تھا لیکن دو دن بھی کم نہیں ہوتے۔ اس کم مدت میں یہ میں نے دیکھا کہ مجروح کو فارسی اور عربی پر عبور حاصل ہے۔ بات چیت میں اگر کوئی شاعرانہ نکتہ آ جائے تو یہ اس کی گہرائی میں جاتے ہیں۔ بالعموم باتوں کا موضوع شعر و شاعری یا شعر و شاعری پر ناقدانہ نظر ہوتا تھا اور مجھے اس اَمر کا یقین ہو گیا کہ عمدہ شاعری کے ساتھ ہی ساتھ علم کا خزانہ بھی مجروح کے پاس

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہے۔ یاں یاد آیا امرتسر کے مشاعرے پر بھی بات چیت شروع ہوئی۔ میں نے کہا "مجروح صاحب آپ نے تو مشاعرہ لوٹ لیا۔ چھتیں اُڑ جانے کا محاورہ تو میں نے سنا تھا لیکن چھتوں کو واقعی اُڑتے ہوئے میں نے امرتسر کے مشاعرے میں دیکھا۔" کہنے لگے "لیکن جگر صاحب نے تو تمھیں بہت زوردار داد دی۔ (یہاں دو ایک دن کی رفاقت میں "آپ"، "جناب" کے تکلفات ختم ہو چکے تھے اور ہم دونوں ترقی کرتے کرتے "تم" اور "تو" کے مقامات تک جا پہنچے تھے۔ لیکن کبھی کبھی "آپ" کے لفظ کا بھی استعمال ہوتا رہا اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا) میں نے پوچھا کب؟ کہنے لگے جب تم کلام پڑھنے کے بعد اپنی جگہ پر آ کر بیٹھے تو انھوں نے تُم سے کیا کہا تھا؟" اچانک مجھے یاد آ گیا کہ جگر صاحب نے فرمایا تھا "بڑی ترقی کرو گے آثار پائے جاتے ہیں۔" میں نے مجروح صاحب کے سوال کے جواب میں جگر صاحب کا یہی جملہ دہرا دیا۔ کہنے لگے "اس جملے میں دُعا بھی شامل ہے اور تمھارے شاعری کے سفر میں یہ دُعا ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے گی۔" میں مجروح کے اس جملے سے بھی بہت متاثر ہوا۔ اور مجروح سے ایک اور بات پوچھی۔ میں نے کہا "مجروح میں نے جگر صاحب کو پہلی بار یہیں دیکھا ہے اور اسی مشاعرے ہی میں اُن کو پہلی بار سنا ہے۔ بلکہ مشاعرے والی تاریخ کو دن کے وقت میں اُن کی قدیم بوی کے لئے اُن کے کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر وہاں رُکا بھی۔ اُن کا کلام میں نے اگرچہ اس وقت تک اُن کی زبان سے سُنا نہیں تھا لیکن اُن کے کلام پڑھنے کی تعریف بہت سُنی تھی مگر مشاعرے میں تو جگر صاحب جم ہی نہیں سکے۔ اُنھوں نے پہلا مصرع ہی پڑھا تھا کہ لوگوں نے اُٹھنا شروع کر دیا حالانکہ اُن کی غزل بھی لاجواب تھی لیکن سامعین اُن کی Performance سے متاثر نہیں ہوئے۔" مجروح صاحب نے جواب میں کہا کہ جب تُم دن کے وقت اُن کے کمرے میں اُنھیں آداب کہنے کے لئے آئے تھے تو میں وہاں موجود تھا۔ لیکن ہم ایک دُوسرے کو جانتے نہیں تھے اس لئے ملاقات یا آپس میں بات چیت نہ ہو سکی۔ اب اُن کے ترنّم کی بات یہ ہے کہ اُن کا ترنّم واقعی ایک زمانے میں بے مثال

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

اور لاجواب تھا لیکن جب سے اُنھوں نے شراب نوشی ترک کی ہے اُن کے ترنم میں وہ بات نہیں رہی۔ ترکِ شراب کا اُن کی آواز پر خراب اثر پڑا ہے۔ اب تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چائے منگواتے ہیں اور شراب کی کمی چائے سے پوری کرتے ہیں۔ دن میں پچیس پچیس اور تیس تیس پیالے چائے کے پیتے ہیں۔ اتنی کثرت سے چائے کے استعمال نے بھی اُن کی آواز پر خراب اثر ڈالا ہے۔ (یہ ۴۴-۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ بعد میں جگر صاحب کی آواز بحال ہوگئی تھی)۔

چائے اور شراب کی بات چیت ختم ہوتے ہی جگر صاحب کی شاعری پر بات شروع ہوئی۔ مجھ سے مجروح نے پوچھا تمھیں یاد ہے اُنھوں نے کون سی غزل پڑھی تھی؟'' میں نے کہا خوب یاد ہے۔ یہ تو ابھی کل ہی کی بات ہے۔ (اگرچہ کئی ماہ یا شاید اُس مشاعرے کو ایک برس گزر چکا تھا) یہ کہہ کے میں نے غزل کا مطلع اور ایک شعر پڑھا ؎

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

کہنے لگے میں اسی دوسرے شعر کی بات کرنا چاہتا تھا۔ تمھاری نظر میں یہ کیسا شعر ہے؟ میں نے کہا۔ ''بہت عمدہ شعر ہے، لاجواب!'' کہنے لگے ''اس میں کوئی فنی غلطی تو نظر نہیں آتی۔'' میں نے کہا ''غلطی تو نہیں ہے، ذرا سا عیب ہے۔'' بولے ''کیا؟'' میں نے کہا ''تقابلِ ردیفین کا عیب ہے۔'' مجروح نے فوراً طنز کے انداز میں کہا ''غلطی نہیں عیب ہے۔'' یہ بھی کیا اُستادانہ بات کی! اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

اس مشاعرے میں مجروح سے فرمائش کر کے تین چار غزلیں سُنی گئیں اور اُنھیں ہر غزل پر بے پناہ داد ملی۔ ان غزلوں کے شاید ایک ایک یا دو دو شعر تو مجھے اب بھی یاد ہیں ؎

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

فضائے ایشیا پہ یہ فضا ہے جنگ کی ساقی
بہار آئی تو سوئے جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

جبیں پہ تاجِ زر پہلو میں زنداں بینک چھاتی پہ
اُٹھے گا بے کفن کب یہ جنازہ ہم بھی دیکھیں گے

اجنبی رات ، اجنبی دُنیا
ترا مجروح اب کدھر جائے

کتنی فسوں طراز ہے صیاد کی نظر
آکر قفس میں بھول گیا بال و پر کو میں

☆

مجروح صاحب کے ساتھ ملاقاتیں اسی طرح مشاعروں میں ہوتی تھیں۔ میں تو اُس وقت تک پنجاب کے باہر کسی مشاعرے میں مدعو نہیں ہوا تھا۔ مجروح صاحب یو پی سے پنجاب تک آتے تھے۔ مذکورہ بالا مشاعرے کے بعد ملاقات پھر پنجاب میں ہوئی۔ یہ مشاعرہ لائل پور (حال فیصل آباد) میں منعقد ہوا تھا۔ لائل پور میں اُس زمانے میں ہر سال دو آل انڈیا مشاعرے منعقد ہوتے تھے ایک لائل پور کاٹن ملز کا مشاعرہ اور دُوسرا وہ جو لائل پور کے سخن فہم اور سخن شناس ڈپٹی کمشنر خواجہ عبدالرحیم' آئی سی ایس کے زیر سرپرستی منعقد ہوا تھا۔ یہ میں ۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کی بات کر رہا ہوں۔ لیکن یہ یاد نہیں آ رہا ہے کہ مجروح لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے میں آئے تھے یا اُس مشاعرے میں جو خواجہ عبدالرحیم کے زیر اہتمام منعقد ہوتا تھا۔ ان دونوں مشاعروں میں سے کسی ایک میں مجروح آئے تھے۔ میں بھی مدعو تھا۔ ملاقات جو اُن کے ساتھ مشاعرے میں ہوئی سلام علیک تک محدود رہی۔ مشاعرے سے پہلے یا بعد میں ملنے کا سوال اس لئے پیدا نہ ہوا کہ میں لاہور سے چلا تو مشاعرہ شروع ہونے سے ذرا پہلے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

لائل پور پہنچا۔ مشاعرہ صبح کے پانچ بجے تک رہا اور میں' احسان دانش اور مجید لاہوری کے ساتھ اُسی صبح چھے بجے کی ریل سے واپس لاہور روانہ ہوا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ہندوستان اور پاکستان میں انڈو پاکستان (یا پاک ہند) مشاعرے منعقد ہونا شروع ہو گئے۔ چمیلو رڈ کلب نئی دہلی ان مشاعروں کے انعقاد میں پیش پیش تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ایک مشاعرہ مجھے یاد آ رہا ہے جس میں مجروح صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس مشاعرے کے باعث ان کے ساتھ اچھی خاصی ملاقاتیں رہیں۔ ایک تو اس مشاعرے میں شرکت کے لئے شعراء کے ساتھ خط و کتابت بالعموم میں ہی کرتا تھا۔ انتظام میں بھی میرا خاصا دخل رہتا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ شعراء کو قیام و طعام کے سلسلے میں کوئی دقت تو نہیں ہو رہی ہے جو کمیٹی تشکیل دی جاتی تھی اُس میں بالعموم میرا نام بھی ہوتا تھا۔ اس لئے جب تک شعراء کا قیام دہلی میں رہتا تھا اُن کے ساتھ میری ملاقاتیں رہتی تھیں اور مجروح کے ساتھ تو خاص طور سے ایک تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔

مجروح کو چمیلو رڈ کلب مشاعرے میں امرتسر والے مشاعرے کی طرح بے تحاشا داد ملی۔ (داد تو کسی مشاعرے میں بھی مجروح کو کم نہیں ملتی تھی لیکن امرتسر اور چمیلو رڈ کلب والے مشاعرے چونکہ دو بہت بڑے مشاعرے تھے اس لئے چمیلو رڈ مشاعرے کے ذکر کے ساتھ ہی مجھے امرتسر کا مشاعرہ یاد آ گیا ہے) اس مشاعرے کے اگلے دن پاکستان ہائی کمیشن (نئی دہلی) میں طعام و کلام کی ایک نشست منعقد ہوئی جس میں پاکستان سے آنے والے تمام شاعروں کے علاوہ ہندوستان سے بھی چند شعراء مدعو کئے گئے تھے۔ اس وقت وہاں مدعو کئے جانے والے پاکستانی یا ہندوستانی شعراء کے نام اس لئے یاد نہیں آ رہے ہیں کہ قریب قریب ۴۰ سال چمیلو رڈ کلب کے مشاعرے کے بعد اور اکثر دہلی کا تھ طرز کے مشاعرے کے بعد پاکستان ہائی کمیشن میں دعوتِ طعام کے ساتھ ہی ایک عمدہ اور معیاری شعری نشست باقاعدگی

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سے منعقد ہوتی تھی۔ اب یہ یاد رکھنا کہ کس مشاعرے میں کون کون سے شعراء مدعو تھے میرے لئے خاصا مشکل کام ہے۔ اتنا یاد ہے کہ مذکورہ نشست میں ہندوستان کے شعراء میں مجروح اور اِس خاکسار کے علاوہ وامق جونپوری اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بھی تھے۔ چیمسفورڈ کلب میں تو کنور مہندر سنگھ بیدی مشاعرے کی کارروائی کو چلاتے ہی تھے، پاکستان ہائی کمیشن کی نشست میں بھی جب وہاں موجود ہوتے تھے یہ اعزاز اُنھی کو دیا جاتا تھا۔ مذکورہ نشست میں جب اُنھوں نے مجروح صاحب سے کلام ارشاد کرنے کی فرمائش کی تو اُن کا تعارف ایک مشہور فلمی گیت کار کہہ کے کرایا۔ اُس وقت مجروح کا چہرہ، جو غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا، دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اُنھوں نے خاصے ضبط سے کام لیا اور کنور صاحب ہی کو خطاب کرتے ہوئے کہا سردار جی، ایک فلمی گیت پیش کر رہا ہوں، سماعت فرمائیے اور یہ کہہ کے اپنی مشہور و معروف غزل شروع کی ؎

جب ہُوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

پہلے شعر ہی پر داد کا وہ عالم تھا کہ خدا کی پناہ۔ یہ داد تو ہر شعر پر زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی لیکن جب مجروح اِس شعر پر پہنچے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

تو داد کی کیفیت حدِّ بیان سے باہر جا چکی تھی لیکن دو یا تین اشعار کے بعد مقطع باقی تھا ؎

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

اِس نقطے پر تو، اگرچہ دعوت یا نشست پندرہ بیس حضرات ہی پر مشتمل تھی، داد و تحسین نے

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

قیامت برپا کردی۔ قبلہ بیدی صاحب بھی ذوق وشوق سے داد دے رہے تھے لیکن جھینپ اور ندامت کی کیفیت اُن کے چہرے سے نمایاں تھی۔ بیدی صاحب کی شرافتِ نفسی کا جواب نہیں تھا اسی لئے اُنھوں نے نشست کے بعد مجروح صاحب سے معذرت بھی کر لی۔ دراصل بات یہ تھی کہ بیدی صاحب کو بھی فلمیں وغیرہ بنانے کا شوق تھا۔ شاید دو ایک یا زیادہ فلمیں اُنھوں نے بنائی بھی تھیں اور ممکن ہے وہ ایماندارانہ طور پر فلمی گانوں کو اعلیٰ پائے کی شاعری سمجھتے ہوں۔ لیکن.........صورتِ حال یہ ہے کہ اُردو کے حقیقی Genuine شعراء نے خواہ وہ جوش ملیح آبادی ہوں، مجروح ہوں، قتیل شفائی ہوں، جاں نثار اختر ہوں، خمار بارہ بنکوی ہوں یا ساحر لدھیانوی' اپنی شاعری کے مقابلے میں فلمی گیتوں کو فروتر مقام دیا ہے اور مناسب بات بھی یہی ہے۔ بلند پایہ شاعری کا ایک معیار ہے لیکن فلمی گیتوں کو پرکھنے والوں کی اکثریت اُردو شعروادب سے بیگانہ ہے۔ یہ اکثریت "میں تو لڑکی کمہار ہا تھا" یا " تو چیز بڑی ہے مست مست" ہی پر لٹو ہو جاتی ہے۔ اس لئے فلمی گیت لکھنے والے شاعر کے لئے اپنی ادبی شعری تخلیق کو فلمی گیتوں سے الگ رکھنا ضروری ہے۔ ویسے اُردو ادب میں گیتوں کا بھی ایک مقام ہے۔ فلم کے لئے گیت لکھنے والے شعراء نے فلم کو بعض معیاری ادبی سطح کے گیت بھی دیئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان گیتوں کا زمرہ Category الگ ہے۔

☆

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔ مقالہ طویل ہوتا جارہا ہے اور میں نے ملاقاتوں کا ذکر چھیڑ دیا مجروح سے۔ ملاقاتیں زیادہ تر مشاعروں میں ہوئیں۔ ہندوستان میں، پاکستان میں، متحدہ عرب امارات میں، یورپ میں، امریکا میں۔ بعض مشاعرے ایسے بھی نظر کے سامنے ہیں جن کے بارے میں یہ یاد نہیں آرہا ہے کہ کس شہر میں منعقد ہوئے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اور مخمور سعیدی بنگلور سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچے۔ وہاں سے ہم دونوں کہاں گئے یہ یاد نہیں۔ مجروح وہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ میری اور مخمور سعیدی کی اُن سے لمبی ملاقاتیں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

۔ ہیں۔ کیا باتیں ہوئیں حافظے میں نہیں ہیں۔ شاید مخمور صاحب کو یاد ہوں۔

اس وقت دہلی کی ایک ملاقات یاد آ رہی ہے۔ مجروح دہلی پہنچے تو اُنھوں نے مجھے ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ میں سہگل کے یہاں مقیم ہوں۔ (سہگل صاحب اُن دنوں کاغذ کا بزنس کرتے تھے۔ پرانی تہذیب میں پرورش پائے ہوئے ایک ادبی ذوق رکھنے والے نوجوان تھے، مہذب اور سخن فہم، ان دنوں معلوم نہیں وہ کہاں ہیں) شام کو آؤ کھانا ہم تینوں اکٹھا کھائیں گے۔ کچھ وقت بہت عمدہ گزرے گا۔" چنانچہ میں شام کو سہگل صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ جام و کلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ گرمی کا موسم تھا۔ غروب کے بعد کمرے سے نکل کے محفل چھت پر جمی۔ جب کھانا کھا چکے تو دیکھا کہ کافی دیر ہو گئی ہے۔ مجروح نے کہا آزاد رات کافی ڈھل چکی ہے۔ سہگل کے پاس گاڑی بھی ہے ڈرائیور بھی ہے۔ ہم دونوں تمھیں گھر پہنچا سکتے ہیں لیکن اگر گھر فون کر دو اور رات یہیں سہگل کے گھر ہی میں بسر کر لو تو کیا ہی کہنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رات میں نے وہاں بسر کی اور دوسری صبح اپنے گھر پہنچا۔

یہ پہلا ہی موقع تھا کہ جب سہگل صاحب کی فرمائش پر میں اپنی نظم نما غزل

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پر کیا گذری

سُنا چکا تو مجروح نے مجھ سے فرمائش کی آزاد! تم اب وہ نظم سناؤ

تری بزمِ طرب میں سوز پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں

اس کے بعد میں نے مجروح سے اس غزل کی فرمائش کی ۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

تو یہ رات بہت دیر تک انھی فرمائشوں اور فرمائش در فرمائش کی تعمیل میں بسر ہوئی۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

☆

اب اس وقت دہلی، لکھنؤ، کراچی اور بعض اور شہروں اور ملکوں کی ملاقاتیں نظر میں ہیں لیکن میں بمبئی کی ایک ملاقات پر اپنی اس بات چیت کو ختم کرتا ہوں۔

میں دو تین روز کے لئے بمبئی گیا جہاں میں عزیز محترم فیاض رفعت کا مہمان تھا جو ان دنوں پٹنہ ٹیلی ویژن کے ڈائریکٹر ہیں۔ اُس وقت فیاض رفعت آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ وہ مجھے ریکارڈنگ کے لئے اپنے دفتر میں لے گئے۔ باتوں باتوں میں مجھے اُنھوں نے بتایا کہ کل مجروح صاحب بھی ریکارڈنگ کے لئے آئیں گے۔ میں نے کہا یار، میں تو خود اُن سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ اُنھیں فون پر بتا دیں کہ میں بمبئی میں ہوں۔ یا تو وہ ریکارڈنگ کے لئے آج یہاں آجائیں یا مجھے اپنے ہاں بلوالیں۔ اگر وہ مجھے اپنے ہاں بلوالیں تو میں اور آپ (یعنی فیاض رفعت) دونوں ساتھ چلیں گے۔

فیاض صاحب نے ٹیلی فون ملایا تو میری بھی اُن کے ساتھ بات ہوئی، طویل بات۔ اُنھوں نے گلہ کیا کہ بمبئی آتے ہو اور ملتے نہیں۔ میں نے نہ ملنے کا سبب بیان کیا کہ آپ بہت دُور رہتے ہیں۔ آپ کے گھر آنے تک کوئی رہنما بھی ہونا چاہئے اور گاڑی بھی۔ کہنے لگے میں گاڑی بھیج سکتا ہوں، وہی رہنما کا کام بھی دے گی۔ تو ایسا ہے کہ آج آپ کھانے پر میرے یہاں آئیے۔ فیاض رفعت کو بھی ساتھ لائیے۔ میں نے کہا یہ آپ فیاض رفعت صاحب سے خود کہئے۔ ہم پرانی نسل کے لوگ ہیں دعوت براہِ راست ہونا چاہئے۔ چنانچہ اُنھوں نے فیاض صاحب سے خود بات کی اور ہم دونوں شام تک مجروح صاحب کے گھر پہنچ گئے۔

اُس محفل میں شاید کلام کی نوبت نہیں آئی۔ جام و طعام ہی تک معاملہ رہا۔ نہ جانے کون سا مذہبی مسئلہ بات چیت میں آگیا کہ مجروح نے اسلام اور ہندو دھرم اور ان دونوں مذاہب کی مذہبی اور سماجی اقدار کے بارے میں اپنی واقفیت کے دریا بہا دیئے۔ میں

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

حیرت زدہ رہ گیا۔

مجروح نے دو تین بار یہ گلہ کیا کہ تم بمبئی آتے ہو، مجھے اطلاع تک نہیں دیتے۔ تمہیں یہیں آ کے ہمارے گھر میں ٹھہرنا چاہئے۔ مجھ سے جواب نہ بن پڑا۔ فیاض رفعت نے میری وکالت کی اور کہا کہ مجروح صاحب آپ کا مکان شہر سے بہت دُور ہے۔ ان کے کام پریس انفارمیشن بیورو تک یا یونیورسٹی تک محدود رہتے ہیں۔ جہاں میں اُن کے قیام کا انتظام کرتا ہوں وہ جگہیں اِن کے لئے مناسب ہیں۔

میں نے اُن کے مجموعہء کلام ''غزل'' کا ذکر کیا کہ میرے پاس یہ کتاب تھی لیکن نہ جانے کون مانگ کے لے گیا ہے۔ اب یہ میرے پاس نہیں ہے تو اُنھوں نے بڑی محبت سے اپنا اور میرا نام لکھ کے ''غزل'' کی ایک جلد مجھے عنایت کی اور بتایا کہ اس کے بعد کی غزلیں بھی میرے پاس ہیں۔ یہ آپ کو بعد میں بھیجوں گا۔ چنانچہ دہلی آنے کے بعد مجھے اُنھوں نے اپنی متعدد غزلوں کی زیروکس کاپیاں بھیجیں۔

ایک اور بات اب یاد آ گئی ہے۔ اب غالباً اسی پر یہ مضمون میں ختم کروں گا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں مشاعرہ تھا۔ غالباً دن کے دس بجے سے ایک بجے تک مشاعرہ تھا اس کے بعد لنچ تھا۔ مجروح نے اُس مشاعرے میں اور غزلوں کے علاوہ یہ غزل بھی پڑھی ۔

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو، ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک گریباں ہوں گے ہم نے عزیزو، چاک گریباں تم سے زیادہ

لنچ کے وقت ہم اکٹھے ہی بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس غزل میں خطاب نئی نسل سے ہے؟ یا اس غزل کا تعلق حالاتِ حاضرہ سے ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ نئی نسل سے خطاب ہے تو سہی لیکن مطلع کی شانِ نزول کچھ اور ہے۔ یہ کہہ کے اُنھوں نے بتایا کہ میری والدہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سلطان پور میں علیل تھیں اور میں بمبئی میں تھا۔ چنانچہ اُن کی عیادت اور دیکھ بھال کے لئے میں سلطان پور گیا۔ تین چار روز وہاں رہنے کے بعد میں نے والدہ سے کہا کہ اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر نظر آرہی ہے۔ والدہ نے کہا کہ کیوں مجھے تم جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میری صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ تم مجھے اس طرح جھوٹ موٹ کی تسلی سے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تم سے چارگریبان زیادہ پھاڑے ہوں گے۔ تو کہنے لگے یہ محاورہ (یا روزمرہ) میرے دل میں گھر کرگیا اور کچھ مدت بعد مذکورہ مطلع موزوں ہوا۔ پھر اسی کے بعد غزل مکمل ہوگئی۔ تمھارا یہ اندازہ صحیح ہے کہ اس میں پرانی نسل کا خطاب نئی نسل سے ہے۔ حالاتِ حاضرہ والا تمھارا اندازہ صحیح نہیں ہے۔

اب مجروح کا کمال یہ ہے کہ بات چیت میں استعمال کئے ہوئے محاورے سے جب وہ متاثر ہوئے اور اسے شعر میں ڈھالنے کا لحہ آیا تو اُنھوں نے اسے ایک طرح کی عالمگیریت دی اور "ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو" سے غزل کی ابتداء کرتے ہوئے اور نئی نسل کو اپنا مخاطب قرار دیتے ہوئے اس محاورے کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اس غزل کی تکمیل کے بعد مجروح کچھ مدت تک تو یہ مصرع اسی طرح پڑھتے رہے یعنی

ع - پھاڑے ہوں گے ہم نے عزیزو، چارگریباں تم سے زیادہ

لیکن بعد میں اس مصرعے کو یوں تبدیل کرلیا

ع - ہم نے عزیزو چاک کیے ہیں چارگریباں تم سے زیادہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سیّد ضمیر جعفری

سیّد ضمیر جعفری مرحوم میرے عزیز اور محترم دوست ہی نہیں تھے بلکہ بڑے بھائی تھے اگر جنوری ۱۹۱۷ء کو اُن کی تاریخِ ولادت حتمی سمجھی جائے تو وہ مجھ سے دو سال بڑے تھے اور یکم جنوری ۱۹۱۵ء سمجھی جائے تو عمر میں چار سال کا فرق تھا۔

☆

اُن سے میری اوّلین مُلاقات راولپنڈی میں ہوئی جہاں میں ایف۔اے کا طالب علم تھا۔ یہ ۳۴ء، ۳۵ء کی بات ہے۔ میں عبدالعزیز فطرت سے ملنے گیا تھا۔ عبدالعزیز فطرت ہی کی مساعی جمیلہ سے راولپنڈی میں پہلی بار ۳۴ء میں انجمنِ ترقی اُردو (ہند) کی شاخ راولپنڈی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ شیخ نذیر احمد وکیل اُس شاخ کے صدر اور عبدالعزیز فطرت اُس کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ فطرت صاحب نے مجھے اپنا اسسٹنٹ سکریٹری مقرر کر لیا تھا۔ انجمن کے جلسے جب ہوتے تھے تو میرا کوئی کنٹری بیوشن ہو یا نہ ہو فطرت صاحب میرا نام تعریفی انداز سے رپورٹ میں لکھ دیتے تھے اور میں اپنا نام اخبار میں پڑھ کے خوش ہوتا تھا۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ہاں تو میں فطرتؔ صاحب کے گھر جب اُن سے ملنے گیا تو وہاں ایک اور صاحب بھی موجود تھے، فطرتؔ صاحب نے تعارف کرایا کہ آپ ہیں سیّد ضمیر جعفری۔ میرا نام بتایا جگن ناتھ آزاد۔ میں نے آداب کیا۔ اُنھوں نے آداب ہی میں جواب دیا۔ اور اسی سانس میں جب فطرتؔ صاحب نے کہا کہ یہ محروم صاحب کے فرزند ہیں تو جعفری صاحب کھڑے ہو گئے اور بڑے تپاک سے میرے ساتھ بغل گیر ہوئے اور بولے کہ تُم تو میرے چھوٹے بھائی ہو اور چھوٹے بھائی کا یہ رشتہ آخر تک قائم رہا۔

اسی پہلی ملاقات ہی کی بات ہے کہ فطرتؔ صاحب نے مُجھ سے فرمائش کی کہ آزاد اپنا تازہ کلام سُنایئے۔ پھر میں پڑھوں گا اور آخر میں جی بھر کے ضمیر جعفری کا کلام سُنیں گے۔ مُجھے اب اِس وقت نہ تو یہ یاد ہے کہ میں نے کون سی غزل یا نظم پڑھی اور نہ ہی یہ کہ فطرتؔ صاحب نے کیا سُنایا لیکن جعفری صاحب سے ہم نے کئی غزلیں نظمیں سُنیں۔ اُس وقت کے اُن سے سُنے ہوئے کلام میں سے صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے اور وہ شعر یہ ہے ؎

تیرے گوچے میں یوں کھڑے ہیں ہم
جیسے ہاکی کے گول کیپر ہوں

اُس وقت ضمیر جعفری اسلامیہ کالج لاہور میں بی۔اے کے طالب علم تھے۔ راولپنڈی جب بھی آتے تھے اُن کی آمد کی اطلاع ہم لوگوں کو ہو جاتی تھی۔ اُس وقت راولپنڈی اِتنا بڑا شہر نہیں تھا جتنا اب ہے۔ اُن کے ساتھ ملاقات سیّد عبدالحمید عدم، عطاء اللہ کلیم، پروفیسر محمد اعظم اور فضل الرحمٰن اشک کے دولت کدوں ہی پر ہوتی تھی۔ وہ دو تین بار والد صاحب سے ملنے ہمارے غریب خانے پر بھی آئے لیکن تازہ تر ملاقاتیں عبدالعزیز فطرتؔ ہی کے یہاں ہوتی تھیں۔ کیونکہ فطرتؔ صاحب اُن کی آمد پر انجمن ترقی اُردو راولپنڈی کے زیرِ اہتمام ایک شعری نشست کا اہتمام کرتے تھے۔ والدِ محترم بھی ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتے تھے اور بالعموم صدر انجمن شیخ نذیر احمد اُنھی سے صدارت

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کی فرمائش بھی کرتے تھے۔

میں چوں کہ سیّد ضمیر جعفری کا ''منہ بولا'' چھوٹا بھائی تھا اس لیے وہ پیار سے مجھے جگن کہہ کر پکارتے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ اُنھوں نے کبھی مجھے آزاد یا آزاد صاحب یا آپ کہہ کے پکارا ہو۔ اور ابھی کوئی ڈیڑھ برس قبل جب ڈیٹرائٹ (امریکہ) کے مشاعرے میں وہ اور میں آخری بار آپس میں ملے تو بھی اُن کا وہی محبت آمیز لہجہ برقرار تھا۔ ہم دونوں کا قیام بھی ایک ہی کمرے میں تھا۔ رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اُن کے پاؤں میں تکلیف تھی۔ شاید اس پر پلستر بھی لگا ہوا تھا۔ بہت دبیز پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پاؤں میں درد بھی تھا لیکن وہ درد سے بے نیاز باتوں میں مشغول تھے۔ اور اپنے ہندوستانی دوستوں بالخصوص راجندر ملہوترہ اور ایک پرنسپل صاحب کے بارے میں پوچھتے رہے (پرنسپل صاحب کا نام یاد نہیں رہا) میں نے جب دو ایک بار کہا کہ مشاعرے میں آپ نے کھڑے ہو کر سامعین کو فرمائش پہ بار بار اپنا کلام سُنایا۔ آپ کوئی ایک گھنٹے تک کھڑے رہے۔ اُس وقت بھی پاؤں پہ دباؤ پڑا ہوگا۔ اب آپ لیٹ جایئے تا کہ پاؤں کو کچھ آرام ملے۔ فوراً جواب دیا۔ ''جگن، تجھ سے ڈیڑھ سال کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ ڈیڑھ برس قبل نیویارک میں ملاقات ہوئی تھی۔ تُو ڈیڑھ برس کے بعد ملا ہے۔ کیا پتہ کل تم کہاں ہو گے اور میں کہاں ہوں گا۔ اب باتیں کرنے کا وقت ملا ہے تو اسے سو کر کیوں گنوائیں۔''

اگلی صبح مجھے ناشتے پر پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ میں جب پہنچا تو مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ تم تو بہت کاہل نکلے۔ ہم لوگ تو ناشتہ ختم کر چکے۔ میں نے اُن کے ساتھ ہی رکھی ہوئی خالی کرسی پر اپنی جگہ سنبھالی اور آداب کے سوا کچھ کہا ہی نہیں تھا کہ ناشتے میں شریک ایک صاحب نے کہا جعفری صاحب یہ تو ہمارے صدر صاحب ہیں۔ کل رات انٹرنیشنل مشاعرے کی صدارت اُنھوں نے کی۔ آپ نے اِن کی صدارت میں اپنا کلام پڑھا اور اب آپ انھیں کبھی ''تُو'' اور کبھی ''تم'' سے خطاب کر رہے ہیں۔ جعفری صاحب نے فوراً جواب دیا کہ یہ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اور جذبات سے مغلوب ہو کر ساتھ والی کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مجھے اپنے ایک بازو میں لے لیا۔

اس وقت مجھے یاد آ رہا ہے کہ ضمیر جعفری صاحب کے علاوہ سیّد عبدالحمید عدمؔ بھی مجھے جگن کہہ کر پکارتے تھے۔ اس وقت عدم صاحب کا یاد آ جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ کیوں کہ ماں، باپ، ماموں، ممانی، چچا، چچی اور سیّد ضمیر جعفری اور عدم صاحب کے بعد میرا خیال ہے کہ اب مجھے ''جگن'' کہہ کے پکارنے والا کوئی باقی نہیں رہا ہے۔ ڈیٹرائٹ کی ملاقات سے پہلے یورپ، امریکا، کینڈا اور پاکستان میں اُن کے ساتھ بیسیوں ملاقاتیں ہوئیں لیکن میں اس تحریر کو ''ہر چہ گیرید مختصر گیرید'' پر عمل کرتے ہوئے دو ایک ملاقاتوں میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اب اس وقت جب کہ میں یہ مُلاقاتیں صفحۂ قرطاس پر رہا ہوں، میں بیان نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت ہو رہی ہے۔ حفیظ جالندھری نے کیا عمدہ کہا ہے ؎

میری بساط کیا تھی حضورِ رضائے دوست
تنکا سا ایک سامنے دریا کے آ گیا

ڈیٹرائٹ کے مشاعرے کے بعد مجھے حمایت علی شاعر، محسن احسان اور رضی اختر شوق کے ہمراہ ایک اور مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے شکاگو جانا تھا۔ ضمیر جعفری کسی اور شہر کے مشاعرے میں مدعو تھے۔ یہی ملاقات اُن کے ساتھ میری آخری ملاقات تھی۔

یہاں برسبیلِ تذکرہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ عزیزم گلزار جاوید، مدیر ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی نے دو ایک برس قبل مجھے لکھا تھا کہ وہ ماہنامہ ''چہارسو'' کا جگن ناتھ آزاد نمبر شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اور رسماً مجھے اجازت دینے کے لیے فرمائش کی تھی حالانکہ چار پانچ برس قبل اسلام آباد میں سیّد ضمیر جعفری ہی نے اُن کا تعارف مجھ سے اور میرا تعارف اُن سے کرایا تھا۔ میں نے انھیں لکھا کہ آپ جگن ناتھ آزاد نمبر شائع کر رہے ہیں تو اس میں اجازت

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

کا کیا سوال۔ مجھے تو اِس بات کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے اور ویسے بھی رسمی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ سیّد ضمیر جعفری کے عزیز ہیں تو میرے بھی عزیز ہیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے لکھا کہ مضامین کا اِنتظام میں خود کرلوں گا۔ لیکن اپنے کلام کا انتخاب جو "چہارسو" کے دس بارہ صفحات پر مشتمل ہو آپ کر کے مجھے بھیج دیں۔

میں نے اُنھیں لکھا کہ شاعر کو اپنے کلام کا اِنتخاب خود نہیں کرنا چاہئے۔ غالبؔ نے اپنے کلام کا اِنتخاب کیا تھا تو بعض بہت اچھے اشعار کو اُنھوں نے نظر انداز کر دیا اور بعض بہت معمولی اشعار انتخاب میں شامل کر لیے۔ مثلاً ۔

ڈھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ اِنتخاب آپ خود کریں اور اگر آپ خاص نمبر کی تدوین میں مصروف ہوں تو میری گزارش میرے برادرِ محترم سیّد ضمیر جعفری تک پہنچا دیں۔ چنانچہ گلزار جاوید نے میری گزارش سیّد ضمیر جعفری تک پہنچا دی اور ضمیر جعفری نے میرے کلام کا اِنتخاب کر کے گلزار جاوید کو بھیج دیا۔ جو "چہارسو" کے جگن ناتھ آزاد نمبر کے بائیس (۲۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ مزے کی بات یہ کہ اُنھوں نے اِس اِنتخابِ کلام پر ایک تمہیدی نوٹ بھی لکھا اور اِس کا عنوان دیا "جگن کے چند جگنو"۔ اُن کی یہ تحریر دل پذیر مکمل طور پر نیچے درج کی جا رہی ہے۔ میرا خیال ہے یہ اُن کی آخری نثری تحریر ہے۔ یہ اگرچہ میرا اندازہ ہے لیکن غالباً غلط نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اپریل میں "چہارسو" کا یہ خاص نمبر منظرِ عام پر آگیا تو گویا یہ مارچ کے وسط کی تحریر ہوگی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اِنتخابِ کلام کی بات فروری کے وسط یا آخر کی بات ہے۔ اور پھر مارچ کو وہ ہسپتال میں داخل کرا دیے گئے۔

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

۲۰ر فروری ۱۹۹۹ء کو اُنھوں نے صفوت علی صفوت کی کتاب ''فکرِ فردا'' کی رُونمائی کے جلسے کی صدارت کی۔ صفوت علی صاحب کے الفاظ میں یہ اُن کی آخری عوامی محفل تھی۔ اس کے بعد چھے مارچ تک صفوت علی صاحب نے اُن کے کسی ادبی جلسے یا ادبی تقریر یا تحریر کا ذکر نہیں کیا۔ بہرطور مذکورہ تحریر دل پذیر نیچے درج کی جارہی ہے:

جگن کے جگنو

''مجھے جب محبی و عزیزی گلزار جاوید نے یہ خوش خبری دی کہ جناب جگن ناتھ آزاد نے آخر کار اپنی ذات سے منسوب ''چہار سو'' کا خصوصی شمارہ مرتب کرنے کی اجازت عطا فرمادی ہے اور اُن کے کلام کے انتخاب کا ذمّہ مجھے سونپا ہے تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ اپنی عمر کے لحاظ سے میں اب کام میں ہاتھ ڈالنے کی بجائے ہاتھ کھینچنے کی طرف مائل ہوں۔ مگر آخری عُمر میں اِتنے بڑے اعزاز کو کہ حاصلِ عُمر ہو جائے میرے لیے چھوڑنا ناممکن تھا۔

جگن ناتھ آزاد اُردو شاعری کا ساہوکار ہے مگر کاروبار خوشیوں کا کرتا ہے۔ یعنی شعر میں فوجی بھرتی روا نہیں رکھتا بلکہ شعر وہ کہتا ہی نہیں۔ اس کی شاعری ذاتی واردات کی شاعری ہے۔ یہ فکر و معانی میں بھیگی ہوئی گہری شاعری ہے۔ اس کے اکہرے شعر کی گہرائی بھی غواصی کی متقاضی ہوتی ہے۔ گہرائی کے ساتھ پھیلاؤ بھی اتنا ہوتا ہے کہ گویا بحرِ اوقیانوس کو ڈوب کر عبور کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال ماحضر اس معذرت کے ساتھ

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

پیش خدمت ہے کہ یہ بہت تشنہ اور کم ہے۔ یہ میری ذاتی
ترجیحات کی نمائندگی کرتا ہے جس سے جگن ناتھ آزاد کے
پرستاروں اور ادب کے ناقدین کو اختلاف کا پورا حق ہے۔"

(سیّد ضمیر جعفری)

یہ مختصری تحریر میرے لیے اُن کی آخری یادگار ہے جس کی عبارت اِس کاغذ ہی پر نہیں ہے بلکہ میرے دِل میں اُتر گئی ہے۔ اور جب تک میں زندہ ہوں یہ میرے دِل میں موجود رہے گی۔ اور میں اِس سے تاحیات روشنی بھی حاصل کرتا رہوں گا اور گرمی بھی۔ یہ محبت بھری تحریر میرے لیے کسی اچھے قومی یا بین الاقوامی اعزاز سے کم نہیں ہے جو اِس وقت تک مجھے ملے ہیں۔ اب میں اپنی اِس تحریر کو اِس دُعا پر ختم کرتا ہوں کہ:

ع۔ خدا کی رحمتوں کا نُور برسے مرنے والے پر!

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

جگن ناتھ آزاد

(حیات اور ادبی خدمات)

(جلد اوّل)

مرتبہ: خلیق انجم

اُردو کے مشہور و ممتاز شاعر، ماہر اِقبالیات، ادیب اور نقاد پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر قاضی عبدالغفار، علامہ سیماب اکبر آبادی، سیّد مظفر حسین برنی، ڈاکٹر محمد اجمل نیازی (پاکستان)، صباح الدّین عبدالرحمٰن، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر ظ. انصاری، ڈاکٹر مظفر حنفی، مسعود خالد (پاکستان)، حسنین جاوید (پاکستان)، حمید جالندھری (پاکستان)، سیّد ضمیر جعفری (پاکستان)، خواجہ حمید الدّین شاہد وغیرہ کے مضامین کا مجموعہ۔ کتاب کے آخر میں ۸۰ صفحات پر تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں۔

قیمت : ۲۵۰ روپے

ملنے کے پتے

☆ انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲

☆ کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷- جوگی گیٹ، جموں- ۱۸۰۰۰۱

☆ فرید یہ بک ڈپو، تالاب کھٹیکاں، جموں- ۱۸۰۰۰۱

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

سلام و پیام

(مشاہیر کے خطوط: جگن ناتھ آزاد کے نام)

(جلد اوّل)

مرتبہ: امین بنجارا

"ان خطوط سے جگن ناتھ آزاد کی ادبی شخصیت کا ایک بے حد کشادہ اور مستحکم نقش قائم ہوتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے ادب کے سچے ریاض میں بڑی محنت کی ہے۔ تلوک چند محروم کا فرزند ہونے کے باعث انھیں ناموری کے مواقع حاصل تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی ریاضت سے اپنا مقام پیدا کیا اور وہ ثمرات بھی حاصل کئے جو ان کے والدِ گرامی تلوک چند محروم حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ تلوک چند محروم کے دور میں ادبائے کرام شہرت کی زن فاحشہ کا تعاقب نہیں کرتے تھے۔ شہرت خود فنکار کو تلاش کرتی اور اس کے سر پہ عظمت کا تاج زرنگار سجا دیتی تھی۔ جگن ناتھ آزاد کے دور میں شہرت کا حصول فن کا درجہ حاصل کر چکا تھا' پبلک ریلیشنگ (تعلقات عامہ) باقاعدہ سائنس بن چکی تھی اور سیاستدانوں کی طرح ادیب بھی اس سائنس کے استعمال عام سے اجتناب نہ کر سکے۔ یہ کتاب اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ جگن ناتھ آزاد نے اس "سائنسی عمل" سے خوب استفادہ کیا اور اپنی ادبی عظمت' اقبال دوستی اور ادب نوازی کا ایک نظر افروز تاثر قائم کیا۔ امین بنجارہ صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے خطوط کا یہ نادر مجموعہ مرتب کیا اور مزید ایک مجموعے کی ترتیب وتدوین کی خبر دی ہے۔ جس کی اشاعت کا انتظار میں نے ابھی سے شروع کر دیا ہے کیونکہ "سلام و پیام" کی طرح اس کا دوسرا حصہ بھی نادر معلومات اور شخصی تاثرات کا گنجینہ ہوگا۔"

ڈاکٹر انور سدید

"الحمرا" پاکستان، ستمبر ۲۰۰۲ء

☆☆ ایڈیشن: اوّل — ☆☆ قیمت: ۲۰۰ روپے

ملنے کے پتے

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۲

کرینٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷- جوگی گیٹ، جموں-۱۱ (جے اینڈ کے) انڈیا

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

ستاروں سے ذرّوں تک

(جگن ناتھ آزاد کا دُوسرا مجموعۂ کلام)

"جگن ناتھ آزاد دورِ حاضر کے دل پسند اور ممتاز شاعر ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے اُنھیں اپنے فرائض کا احساس ہے اس وجہ سے وہ ستاروں کو نظر انداز کرتے ہیں نہ ذرّوں کو۔ آزاد کے شعروں کی نرم آواز اور دھیمی کسک جو بظاہر ایک قسم کے شخصی اظہار اور ذاتی اُفتادِ طبع کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، آہستہ آہستہ سُننے اور پڑھنے والے کے احساس کا جزو بن جاتی ہے۔ متاثر کرنے کی یہ صلاحیت حقیقی جذبات کے پیش کرنے اور فن کے شعوری طور پر برتنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں باتیں آزاد کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہیں جن کا ارتقاء چند برسوں کے اندر ہُوا ہے۔ لاہور نے اُنھیں شعر کہنے اور شعری فضا میں رہنے بسنے پر مائل کیا تھا۔ لاہور کے فراق نے اُن کے کلام میں گداز، انسانیت اور غنائیت کے عناصر پیدا کیے ہیں۔ اُنھی عناصر کے فنکارانہ اظہار میں اُن کی ہر دل عزیزی اور ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔"

احتشام حسین

چھٹا اڈیشن

قیمت: ۹۰/روپے

ملنے کے پتے

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷-۲، جوگی گیٹ، جموں-۱۸۰۰۰۱

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com

نسیمِ حجاز

جگن ناتھ آزاد

"جگن ناتھ آزاد نے مُسلمانوں کی شان و شوکت سے معمُور تاریخ و روایت اور پُر فخر اور نا قابلِ فراموش کارناموں کو یاد دِلا کر اُن سے سوال کیا کہ آخر وہ اپنی شاندار رِوایات و خصوصیات سے کیوں دست بردار ہوتے جا رہے ہیں۔ اُن کا جمال و جلال تو اپنی عظیم الشان روایت اور اپنے مُمتاز اوصاف سے وابستہ رہنے میں ہے اگر اپنی تہذیب سے ان کے بے گانہ وشی کا یہی حال رہا تو اُنھیں تاریخ کا افسانہ بن جانے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ جگن ناتھ آزاد کی تلقین یہ ہے کہ مُسلمان اِس مُلک میں اپنے اِمتیازات و تشخصات کے ساتھ رہیں اور اپنی عظمتوں کے آثار اور گنجینوں کے محافظ ہیں۔"

ضیاالدّین اصلاحی

مدیر ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ (یوپی)

☆ایڈیشن: پہلا ☆ہدیہ: ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتا

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷، رجوگی گیٹ جموں۔ ۱۸۰۰۰۱

Academy of the Punjab in North America: http://www.apnaorg.com